فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۶۵

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء تا جون سنہ ۱۹۵۰ عیسوی

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

جلد ۶۵

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء تا جون سنہ ۱۹۵۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۶۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۰ء عدد ۱

مضامین

———

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افسوس کہ آج قلم کو اس ہستی کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے جو ساری عمر قوم و ملت کی غم گسار رہی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کا سانحہ نہ صرف پاکستان بلکہ علمی و مذہبی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، وہ اس دور کے جلیل القدر عالم، متبحر فاضل، نامور خطیب اور صاحب بصیرت مدبر تھے، دینی علوم مین ان کا پایہ بہت بلند تھا، انکی ساری عمر ان کی خدمت مین گذری، برسون دار العلوم دیوبند مین ان کا علمی فیض جاری رہا۔ پھر ڈابھیل (سورت) کی مشہور دینی درسگاہ مین چلے گئے، اور وہان کئی سال تک ان کے درس و افاضہ کا سلسلہ قائم رہا۔ قرآن مجید پر انکا اردو حاشیہ موضح الفرقان اور صحیح مسلم کی ضخیم عربی شرح فتح الملہم ان کا بڑا علمی و دینی کارنامہ ہے، اسکے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی تصانیف بھی اُن کی یادگار ہین،

ملکی اور قومی کامون مین بھی ان کا حصہ رہا ہے، وہ عرصہ تک جمعیۃ العلماء کے شریک کار رہے، پھر پاکستان کی تحریک کے بعد مسلم لیگ مین شامل ہوگئے، اور جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر منتخب ہوئے، اور پاکستان کی تبلیغ و اشاعت مین بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، اس کے چند ممتاز بانیون مین سے ایک وہ بھی تھے، قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، اور آئین ساز دستور ساز اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے، پاکستان مین اُن کی حیثیت مذہبی مشیر کی تھی، اور حکومت کے ارکان پر اُن کے علم و عمل، تقوی و دیانت، فہم و فراست، اخلاق و سیرت اور استغنا و بے نیازی کا بڑا اثر تھا، اور اُن کی ذات سے پاکستان کی مذہبی اصلاح کی بڑی امیدین وابستہ تھین، لیکن افسوس موت نے اس کا موقع نہ دیا، اور گذشتہ ۱۳ر دسمبر کو بغداد الجدید ریاست بہاولپور مین علم و عمل کی یہ شمع دفعۃً خاموش ہوگئی، اس حادثہ سے علمی و مذہبی دنیا ایک جلیل القدر عالم سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ اس خادم دین و ملت کو اپنی رحمتون اور برکتون سے نوازے،

دوسرا علمی حادثہ دنیائے اسلام کے مشہور عالم موسیٰ جار اللہ کی وفات ہے، ان کا وطن روسی ترکستان تھا، وہ بڑے وسیع النظر عالم اور زندہ کتب خانہ تھے، اور ہر موضوع اور ہر فن پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے، روسی ترکی، عربی فارسی مین پوری مہارت رکھتے تھے، اردو بھی ٹوٹی پھوٹی بول لیتے تھے، ایک زمانہ تک لینن کے رفیق، اور شریک کار رہے، پھر کسی اختلاف کی بنا پر جلا وطن کر دیئے گئے، جلا وطنی کے زمانہ مین انھون نے تمام اسلامی ملکون کی سیاحت کی، اس سلسلہ مین ہندوستان بھی آئے، اور کئی سال تک دہلی اور بھوپال مین مقیم رہے، چودہ پندرہ سال ہوئے دار المصنفین بھی آئے تھے، ایک ہفتہ عشرہ قیام رہا تھا، اُن کے علمی شغف و انہماک کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، ان کا سارا وقت اور رات کا بڑا حصہ مطالعہ مین گذرتا تھا، انھون نے اس مختصر قیام مین دار المصنفین کے پورے کتب خانہ کا جائزہ لے لیا تھا، تالیف و تصنیف کا شغل بھی تھا، عربی مین اُن کی بہت سی تصانیف مسودہ کی صورت مین تھین، لیکن چند مختصر رسالون کے علاوہ کسی بڑی تصنیف کی اشاعت کی نوبت نہین آئی، جب سے وہ وطن سے نکلے پھر دوبارہ جانا نصیب نہین ہوا، اور عالم غربت ہی مین گذشتہ مہینہ مصر مین سفر آخرت کیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

کانگریسی حلقہ مین بابو راجندر پرشاد گاندھی جی کے خاص چیلے اور بڑے مقلد سمجھے جاتے ہین، لیکن زبان کے بارہ مین اُن کا رویہ سب سے زیادہ حیرت انگیز رہا ہے، ایک زمانہ مین وہ گاندھی جی کے اصول کے مطابق ہندوستانی کے بڑے حامی تھے، اور دس بارہ سال پہلے پٹنہ مین زبان کے مسئلہ مین جو سمجھوتہ ہوا تھا، وہ "راجندر عبدالحق پیکٹ" کے نام سے موسوم تھا، یہ تو خیر پرانا قصہ ہے، ہندوستان کی آزادی کے بعد جب ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت کا طوفان اٹھا اس وقت بھی وہ ہندوستانی کی حمایت پر قائم رہے، لیکن جب دستور ساز اسمبلی مین زبان کا مسئلہ پیش ہوا، تو وہ دفعۃً ہندی کے حامی بن گئے، اور جب ہندی حکومت کی زبان قرار پا گئی تو سب سے زیادہ مسرت کا اظہار انھی نے کیا، اور اس کو بڑا قومی کارنامہ اور ملک کی بہت بڑی خدمت قرار دیا، تاہم اس وقت انھون نے ہندی کی جو تعریف کی تھی، وہ ہندوستانی سے قریب تھی، یعنی ایسی سہل ہندی جس کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے، اور جس کا دامن ہندوستان کی تمام زبانون کے آسان اور عام فہم الفاظ کے لئے وسیع ہو، لیکن انھون نے خود اس زبان کا جو نمونہ پیش کیا، اور گذشتہ مہینہ لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد مین جو خطبہ پڑھا وہ ایسی مشکل ہندی مین تھا کہ اس کو بہت کم لوگ سمجھ سکے، یہ ساری سرگذشت اخبارون مین موجود ہے، جب گاندھی جی کے خاص مقلدون کا یہ حال ہے، تو عام لوگون کا کیا ذکر ع:۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا،

لیکن اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرنا ناانصافی ہوگی کہ گاندھی جی کے سچے مقلدون مین آج بھی ایسے حق پرست اور حق گو موجود ہین جن کو اس حقیقت کے اعتراف مین باک نہین کہ اردو ہی ملک کی عام اور مشترک زبان ہوسکتی ہے، پنڈت سندر لال نے حال ہی مین اردو مجلس حیدرآباد کے ایک جلسہ مین نہایت واضح اور صریح الفاظ مین اس کا اظہار کیا کہ مین نے ہندوستان کے گاؤن گاؤن مین گشت کیا ہے، ہر جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، کتابی اردو عام زبان ہے لیکن کتابی ہندی عام زبان نہین ہے، اور نہ یہ عام زبان بن سکتی ہے، اردو میری مان اور میری دادی کی بھی مادری زبان تھی، ...... ہندی کے نام سے جو زبان گڑھی جارہی ہے وہ چلنے والی نہین ہے"، اسی کے ساتھ انھون نے مسلمانون کو بھی زبان کے بارہ مین مفید مشورے دیئے ہین، جو اُن کے لئے قابلِ غور ہین، لیکن ہندی کے نقارخانہ مین طوطی کی آواز کون سنتا ہے،

اخبارات کے نامہ نگارون اور خبر رسان ایجنسیون کو خبرون کے گڑھنے مین جو کمال حاصل ہے اس کا تازہ نمونہ یہ ہے کہ ان کے حوالہ سے کئی ذمہ دار اخبارون مین جلی سرخیون سے یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے شعبۂ مذہبی کے مشیر کی حیثیت سے بھوپال سے قطع تعلق کرکے پاکستان چلے گئے اور اس وقت کراچی مین مقیم ہین اور یہ خبر اتنی جزوی تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی کہ بہت سے آدمیون کو اس کے یقین کرنے مین شک و شبہہ نہو، حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہین تھی، واقعہ صرف اتنا تھا کہ موصوف حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، اور واپسی مین دیر اس لئے ہوئی تھی کہ مدینہ منورہ مین زیادہ قیام رہا تھا اور اب وہ ۲۹ دسمبر کے جہاز سے مع الخیر ہندوستان واپس آگئے اور اس وقت بھوپال مین مقیم ہین،

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مالی لین دین کا سلسلہ بند ہونے کی وجہ سے دونون ملکون کے درمیان وی پی بھی نہین جاسکتے، اس لئے پاکستان کے معارف کے خریدارون اور قدردانون کو بڑی تشویش ہے، اور ان کے بکثرت خطوط آرہے ہین، ان کو اطمینان رکھنا چاہئے، انشاء اللہ معارف اُن کے نام جاری رہے گا، جب سکہ کے تبادلہ کا مسئلہ حل ہوجائے گا تو وہ چندہ بھیج دین گے،

انجمن ترقی اردو ہند (علی گڈھ) کے پرانے اخبار ہماری زبان کا پہلا نمبر نکل گیا ہے، اسمین ہندوستان مین اردو زبان کی نوعیت، حیثیت اور اس کی خدمت کے بارہ مین انجمن کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اردو زبان کے متعلق متفرق خبرین ہین، دو چار نمبر دیکھنے کے بعد اس کا صحیح اندازہ ہو سکے گا، پرچہ کی ضخامت ۸ صفحے ہے، اور خوبصورت ٹائپ مین چھپتا ہے، سالانہ قیمت دو روپیہ ہے، اردو زبان کے حامیون اور ہمدردون کو اس کی اشاعت مین پوری کوشش کرنا چاہئے،

مقالات

ہندوستان مین توپ کی تاریخ

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۲)

اوپر کے بیانات سے یہ بات تو صاف طور پر ظاہر ہوگئی کہ مغل سلطنت کے بانی بابر کے ہندوستان مین آنے اور پانی پت کی جنگ سے قبل ہندوستان کے مختلف صوبون مین توپ کا رواج ہوچکا تھا، اس لئے بابر کو ہندوستان مین پہلا توپ استعمال کرنے والا قرار دینا صحیح نہین ہے،

بابری توپین بابر کے پاس پانی پت کے میدان مین توپین ضرور تھین، مگر سب معمولی اور اس کا توپخانہ گجرات اور دکن کے توپ خانون جیسا ترقی یافتہ نہ تھا،

بابر سنہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء کے حالات مین مختلف مقامات پر توپ کا ذکر کرتا ہے، ہندوستان پر حملہ کے وقت جب اُس نے لشکر شماری کی، اور اُس کے گمان سے فوج کی تعداد کم نکلی، تو اس کو محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے رومی طریقہ اختیار کیا، ایک جگہ لکھتا ہے :-

"مین اپنے لشکر کو جس قدر سمجھتا تھا، تخمینہ کے وقت اس قدر نہ نکلا، اُسی منزل مین توقف کیا تاکہ جسقدر ہوسکے ارابہ تیار کرلین، سات سو گاڑیان ارابہ تیار ہوئین، استاد قلی کو حکم دیا

کہ رومی طریقہ سے گاڑیوں کو زنجیر کے بدلے رسیوں سے باندھ دیں، ہر جگہ دو گاڑیوں کے بیچ میں چھ سات جالی کے خانہ ہوں، گولہ انداز ان چھکڑوں اور گاڑیوں کے آڑ میں کھڑے ہو کر گولہ ماریں[1]

پانی پت کی جنگ میں اُس نے توپ کا استعمال جس طرح کیا، وہ اس کی دلیل ہے کہ بابر ایک جنگ آزمودہ تجربہ کار اور ماہر فن جنرل تھا، اُس نے فوج سے غنیم کو مشغول رکھ کر توپ سے دشمن کو تباہ کر ڈالا، چنانچہ لکھتا ہے:

"محمدی کوکلتاش اور لاس، اور یونس کو حکم دیا کہ قول (قلب) سے بڑھ کر لڑائی شروع کر دیں، استاد علی قلی (بندوقچی) بھی قول کے آگے آکر فیر کرنے لگا، مصطفیٰ توپچی دست چپ سے خوب گولے مارنے لگا، تولغمہ والوں نے چاروں طرف سے غنیم کو گھیر لیا،......... وہ بے شمار لشکر دوپہر تک کے عرصہ میں خاک میں مل گیا،[2]

توپ ڈھالنے کا کارخانہ

۹۳۳ھ کے حالات میں توپ ڈھالنے کا حال بہ تفصیل اس طرح لکھتا ہے،

"بیانہ کے قلعہ اور دوسرے قلعوں کے خیال سے جو ہنوز فتح نہیں ہوئے تھے، استاد علی قلی کو ایک بڑی توپ ڈھالنے کا حکم دیا، علی قلی نے بھٹی وغیرہ تیار کر کے مجھے اطلاع دی، ۲۵ محرم یوم دوشنبہ کو توپ ڈھلنے کا تماشا دیکھنے گیا،"

"جہاں توپ ڈھلنے کا سانچا تھا وہاں آٹھ بھٹیاں لگائی تھیں، ہر بھٹی کے نیچے سے ایک نالی سانچے تک بنا دی تھی، بھٹیوں کی نالیوں کا منہ کھلتے ہی نالیوں سے مصالحہ پانی کی طرح بہ کر آیا، لیکن سانچا پورا نہ بھرا تھا، کہ مصالحہ کا آنا رک گیا، یا تو بھٹیوں میں کوئی خرابی تھی، یا مصالحہ میں، استاد قلی اتنا شرمندہ ہوا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ پگھلے ہوتے تانبے

[1] تزک بابری ۹۳۲ھ کے حالات [2] ایضاً

میں کود پڑے، لیکن میں نے اس کی دلجوئی کی، اور خلعت دے کر اس کی شرمساری کو دور کیا، قالب خشک ہونے، اور مٹی وغیرہ ہٹانے کے بعد خوشی خوشی کہلا بھیجا کہ توپ کے گولہ کا گھر بہت خاصہ ہوا، اس کا درست کر لینا سہل ہے، اس کو نکال کر درست کرنے کے لئے اوروں کے حوالہ کیا، اور آپ باقی کے بنانے میں مشغول ہوا،[1]

اسی توپ کی نسبت آگے چل کر تحریر کرتا ہے،

"اُستاد علی قلی نے وہ توپ ڈھال کر تیار کر لی تھی، جس کے گولہ کا گھر پہلے ہی ڈھل چکا تھا، اس کی نال بعد میں درست ہوئی، ہفتہ کے دن بیسویں تاریخ کو اس کے چھوڑنے کا تماشا دیکھنے گیا، عصر کے وقت اس کو چھوڑا، چھ سو قدم تک اس کا گولہ پہنچا، اُستاد کو میں نے خنجر اور خلعت انعام میں دیا،[2]

۹۳۴ھ کے ابتدائی حالات تحریر کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"اتوار کے دن استاد علی قلی نے بڑی توپ چھوڑی، اگرچہ گولہ دور تک گیا، لیکن توپ کے ٹکڑے اڑ گئے، اس کا ہر ٹکڑا ادھر ادھر لوگوں میں جا کر گرا، آٹھ آدمی مرے،

جنگ رانا سانگا اور چندیری کے محاصرہ میں بھی توپ اور بندوق کے استعمال سے بابر ہر جگہ کامیاب رہا، قنوج کے پاس گنگا کے پار اترتے وقت، بابر نے ایک پل بنانے کا حکم دیا، دشمن اس میں حارج ہوا، استاد علی قلی نے توپ سے اس طرح مدافعت کی کہ دشمن پاس نہ آسکا، اور پل تیار ہو گیا، بابر لکھتا ہے:-

"ملک قاسم اس لڑائی میں کام آیا، پل بندھنے تک استاد علی قلی نے خوب گولہ باری کی، پہلے دن آٹھ گولے مارے، دوسرے دن اٹھارہ گولے برسائے، تین چار دن تک اسی طرح گولہ باری کی، یہ گولے "غازی" نام توپ سے مارے تھے، اسی توپ سے راجہ سانگا کی لڑائی

[1] تزک بابری ۹۳۲ھ کے حالات [2] ایضاً ابتدا جنگ رانا سانگا،

مین کام لیا تھا، اور لڑائی فتح ہونے کے بعد اس کا نام غازی رکھا (پہلے اس کا نام بابری تھا) ایک توپ اس سے بڑی تھی، جو ایک ہی دفعہ چھٹ کر پھٹ گئی، بندوقچیون نے بھی گولیون کی خوب بوچھار کی،[1]

معلوم ہوتا ہے غنیم کے پاس توپین نہ تھین، کیونکہ فتح پانی پت کے بعد مال غنیمت کی فہرست مین بابر نے توپون کا کہین ذکر نہین کیا ہے، اس کے علاوہ قنوج کے پاس پل باندھنے تک غنیم توپ کا جواب توپ سے دینے کے بجائے گولہ اندازی پر ہنستا تھا، جیسا کہ بابر نے تزک مین اس کا تذکرہ کیا ہے، رانا سانگا کے پاس مالوہ سے حاصل کردہ توپین ضرور ہون گی مگر وہ صرف قلعہ شکن ہونگی یا کوئی اچھا ماہر گولہ انداز اس کے پاس نہ ہوگا، جو بابر کے گولہ انداز کا مقابلہ کرسکتا ہو سنہ ۹۳۴ھ کے حالات مین ایک جگہ تحریر کرتا ہے:-

"یہ بات قرار پائی کہ دریائے گنگ اور سرو کے درمیان کسی بلند جگہ استاد علی قلی رومی اور ہندوستانی توپین کھڑی کرے، بہت سے بندوقچی اس کے ہمراہ ہون، وہان سے گولون اور گولیون کا مینہ برسائے، جہان دونون دریا ملتے ہین، اس سے نیچے کی جانب اس مقام کے سامنے جس مقام پر بہار کی طرف گنگا مین بہت سی کشتیان کھڑی ہین، مصطفےٰ اپنے توپخانہ کو درست کرکے لڑائی مین مشغول ہو، اس کے ساتھ بھی بہت سے ..... بندوقچی ہون، محمد زمان مرزا وغیرہ مصطفےٰ کے پیچھے کمک پر رہین، استاد علی قلی اور مصطفےٰ کی توپون کے لئے مورچے قائم کئے جائین،[2]

پھر جب اس مشورہ پر عمل ہوا اور بابر گنگا پار اتر کر توپ خانہ کے پاس آیا، تو رومی توپون کی نسبت تحریر کرتا ہے:-

[1] تزک بابری سنہ ۹۳۲ھ کے حالات بیان پورب کے باغی [2] تزک بابری بنگالیون سے مقابلہ،

"مین نے جا کر استاد علی قلی کی گولہ باری کا تماشا دیکھا، آج ہی اس نے رومی توپون کے گولے سے دو کشتیون کو توڑ کر غرق کر دیا، میدان جنگ مین بڑی توپ لیجانے، اور اس کے واسطے جگہ درست کرنے کو ملا غلام کو مقرر کیا،

ان بیانات سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صرف بابر کے پاس توپ تھی، اور غنیم خالی ہاتھ تھا، بنگالی ہر طرح سے بارود کا استعمال کر رہے تھے، اور اپنے دشمن پر برابر آگ برسا رہے تھے، جس سے اس کو نقصان بھی پہونچتا تھا، بابر خود اس کا اقرار کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"ظہر کے وقت استاد کے پاس سے آدمی آیا، اور کہا کہ گولہ تیار ہو گیا ہے، کیا حکم ہوتا ہے؟ مین نے حکم دیا کہ اس کو رہنے دو، اور میرے آنے تک دوسرا تیار کر رکھو، عصر کے وقت ایک بنگالی دونگہ مین سوار ہو کر مورچہ پر پہنچا، استاد نے ایک بار بڑا گولہ مارا، پھر کئی دفعہ رومی گولے مارے، بنگالی آگ برسانے مین مشہور تھے، اس دفعہ مین نے اُن کو خوب دیکھا، ایک جگہ سے آتش بازی نہین کرتے، بلکہ مختلف مقامات سے کرتے ہین .... ہم نے دیکھا کہ بنگالی کشتیان جمع کئے ہوئے ایک تنگ مقام پر آمادۂ جنگ ہین، ہماری ایک بھلی کشتی کے پاؤن مین گولہ لگا، اس کا پاؤن ٹوٹ گیا، اور ہم آگے نہ جا سکے"[1]

آخر زمانہ مین بابر نے توپ کا نام "ضرب زن" رکھا تھا، مگر اس لفظ کو قبول عام حاصل نہ ہوا، شیر شاہ کا عہد نہایت مختصر رہا، اس لئے وہ اس محکمہ مین کوئی خاص ایجاد و اضافہ نہ کر سکا، اس کے پاس جو توپ خانہ تھا اس مین کچھ توپین تو بابر کی تھین، اور کچھ وہ گجراتی توپین تھین، جو ہمایون گجرات اور مالوہ سے اٹھا لایا تھا، اگر شیر شاہ کو موت نے مہلت دی ہوتی، تو وہ دوسرے محکمون کی طرح اس کو بھی بہت ترقی دیتا،[2] شیر شاہ کے بعد پھر کسی کو خانہ جنگیون سے فرصت نہ ملی کہ اس کی طرف

[1] حالات مذکور سنہ ۹۳۵ھ [2] صولت شیر شاہی کے مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قلعہ رانتین مین ایک ہزار توپچی رہتے تھے، اسی طرح غالباً دوسرے قلعون مین بھی ہون گے،

توجہ کرکے اس کو ترقی دیتا،

دکنی توپین — نوین صدی کے اختتام پر سلطنت بھمنیہ کے مختلف اضلاع پر بڑے بڑے امرا قابض ہو گئے تھے، ان مین تین سب سے زیادہ طاقتور تھے، یوسف عادل شاہ، نظام شاہ، قطب شاہ اور چوتھا منبر برید شاہ کا تھا،

عادل شاہیون کا پایۂ تخت بیجاپور تھا، اُن کی سلطنت دوسو برس ۸۹۶ھ سے ۱۰۹۷ھ تک رہی، انھون نے دوسرے شعبون کی طرح فوجی نظام کو بھی ترقی دی، اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایک طرف تو بیجانگر کی ہندو ریاست سے اُن کی جنگ رہتی، اور دوسری طرف اسلامی ریاستین اُن کو چین نہ لینے دیتین، اس کے علاوہ ترک، عرب اور ایران سے اُن کے تعلقات براہِ راست آخر تک قائم رہے، اس لئے اس کا توپ خانہ بڑا مکمل تھا، توپ سازی کا ایک کارخانہ بھی تھا، جہان توپین ڈھلتی تھین،

اسی طرح نظام شاہ کے پاس بھی توپ سازی کا کارخانہ تھا اس مین ایسی ایسی توپین بنائی گئین، جو آج تک یادگار ہین، ان توپون کا کچھ مختصر حال تحریر کیا جاتا ہے[1]،

قلعہ اودگیر (مملکت نظام) کے ایک برج پر "شیر بچہ" نامی ایک توپ نصب ہے جس کا طول سات فیٹ اور دہانے کا قطر ۹ انچ ہے، اسی کے دوسرے برج پر ایک خوبصورت تانبے کی توپ چڑھی ہے، یہ ۱۱ فیٹ لمبی اور نو انچ دہانہ کا قطر ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شکل نگمہ کی سی ہے،

نظام شاہی توپین — قلعہ اوسا (نظام) میں گیارہ توپین تھین، ان مین سے بعض کے نام یہ ہین،

نظام شاہی، بتہری، کڑکن بجلی، تہری، شیر دہان، الم جھڑی، لکالا پہاڑ وغیرہ،

نظام شاہی توپ ۱۰ فیٹ طویل ہے اور دس انچ دہانہ کا قطر ہے، پتھر کے گولہ کے علاوہ ایک گولہ آہنی بھی خاص اس کے لئے تیار کیا گیا تھا، اس مین ایک سوراخ ہے، جنگ کے وقت اس مین نشتر، چاقو، قینچی، پیسہ وغیرہ بھر کر فیر کرتے تھے، اس کا وزن ۵۵ سیر ہے، توپ پر یہ عبارت کندہ ہے "ابوالغازی

[1] دکن کی توپون کا حال مین نے تاریخ ملکت بیجاپور مطبوعہ آگرہ سے لیا ہے اور کچھ میری خود چشم دید ہین،

شاہ نظام، عمل استاد محمد ان حسین[1] رومی" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے توپ ساز عموماً رومی، (ترکی) ہوتے تھے، دوسرے کتبون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،

بھمنی توپین — ایک اور توپ قلعۂ اوسا کے "چاندنی برج" پر ہے، جو دس فیٹ طویل اور چھ انچ دہانہ کی ہے، اسی کے ساتھ دوسری ۶½ فیٹ طویل اور نو انچ دہانہ والی ہے، اس پر عربی مین کچھ عبارت کندہ ہے، جو افسوس ہے کہ پڑھی نہین جا سکی، اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ توپ غالباً بھمنی عہد کی ہے، کیونکہ اس عہد مین عموماً ہر قسم کے کتبے عربی مین ہوتے تھے،

برید شاہی توپین — قلعہ بیدر کے فتح برج پر ایک توپ رکھی ہے، جس کا نام "فتح لشکر" ہے، پنج رسی دھات کی بنی ہوئی ہے، اس دھات کو سنگری کہتے تھے، یہ توپ ڈھلی ہوئی ہے، اس کا طول ۱۶½ فیٹ، قطر ۲ فیٹ تین انچ اور دہانہ کا قطر ایک فیٹ دو انچ ہے، اس پر بسم اللہ کے بعد یہ عبارت کندہ ہے:-

"اس توپ مین ایک من دس سیر بارود اور ½ ۵ من کا گولہ دیا جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص چاہے تو دس سیر بارود اور زیادہ کر سکتا ہے، پھر سورۂ فتح کی ابتدائی آیتون کے بعد لکھا ہے:-

"توپ ظفر پیکر مسمی بہ فتح لشکر، در زمان دولت اعلیٰ حضرت عالیجاہ میرزا شاہ محمود المخاطب بہ ہمایون اکرم برید شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ، فی التاریخ ۹۵۵ھ پھر فارسی کے یہ دو شعر ہین،

فتح لشکر کہ ز ہمتش دل اعدای حزین	راست چون برق فرود آمدہ بر روئے زمین
تند چون در دہن اژدر کہ پئے جنگ بود	اژدہائے کہ سر خصم فرو برد بہ کین

آخر مین قرآن کے تمام حروف مقطعات کے بعد نادعلی کندہ ہے،

محمودی توپ — اس شہر کے "منڈلہ برج" پر "محمودی توپ" رکھی ہے، جو ۹۰۵ھ کی بنی ہوئی ہے، اس پر

[1] غالباً محمد حسین رومی ہے،

مندرجۂ ذیل اشعار کندہ ہیں،

حبذا توپے پُر آشوب زآوازے بلند — گر کند گوشے فلک را بر کند کوہ از دمن

شاہ کسری معدلت قاسم برید — بادشاہ ہند و سند و مالک ملکِ دکن

اختتام توپ در شہر محرم بودہ است — توپ محمودی کہ نامش شد ز شاہ صف شکن

نغلی می جست تاریخش سروش غیب گفت — توپ بے مثل بود تعریف او در ہر قرن ۹۰۵

ہفت گزی | ایک اور توپ قلعہ بیدر کے ایک برج پر رکھی ہوئی ہے، اس کا نام ہفت گزی ہے، یہ علی برید شاہ کے عہد ۹۵۵ھ میں تیار ہوئی، یہ ۲۱ فیٹ طویل اور ۲۳ فیٹ مدور ہے، اور زنجِ رسی نیلگون دھاتی ہے، اس پر ایسی جلا ہے کہ انسان اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے، یہ توپ دولت آباد اور بیجاپور کی توپوں کے ہم پلہ ہے، اس پر ذیل کی عبارت کندہ ہے:

یکے از غرائب علامات کارخانہ الٰہی توپ شاہی وضع خاصہ حضرت نواب ہمایون اکرم علی برید شاہی تمت فی التاریخ ۹۶۶ھ ہجرۃ النبویہ،

غلولہ دہ من نیم دارو دو من ونیم، اگر خواہد ازین زیادہ کند صافی کند، دہ آثار زیادہ اندازد،

قلعہ پرینڈہ کے ایک برج پر ایک توپ رکھی ہے، اس کو "لانڈے قصاب" کہتے ہیں، یہ توپ ڈھلی ہوئی نہیں ہے، بلکہ لوہے کے پتر جوڑ کر بنائی گئی ہے، یہ ۱۸ فیٹ دو انچ طویل ہے، اس کے کان کے پاس کا دور سات فیٹ دو انچ، اور دہانے کا چھ فیٹ گیارہ انچ ہے،

قلعہ رائچور (مملکت نظام) میں ایک توپ رکھی ہے جس کا دنبالہ ٹوٹ گیا ہے، یہ ۲۰ فیٹ ۸ انچ طویل ہے، اس کی ساخت اس طرح کی ہے کہ فولادی پٹیاں جما کر اوپر سے فولادی پیچ کس دیئے گئے ہیں، اس توپ کے نیچے اس کو گھمانے کی جو کل لگی ہے، جسے انگریزی میں (ٹرنین) کہتے ہیں، وہ امتدادِ زمانہ

کے باوجود اب بھی اچھی حالت میں ہے، اتنی بڑی بھاری توپ کو اس کی مدد سے جدھر چاہیں آسانی سے پھرا سکتے ہیں،

ضلع رائچور کے قلعۂ انتوڑ میں بہت سی توپیں تھیں، جو انگریزوں نے ضائع کر دیں، اس وقت صرف ایک توپ ہے جو نو ہاتھ لمبی اور اس کے دہانہ کا دور ایک ہاتھ ہے، اس کو برج پر سے کسی نے لڑھکا دیا ہے، اور اب وہ خندق میں پڑی ہے، یہ بہت بھاری ہے، اس کا جگہ سے ہلنا بھی دشوار ہے۔

کالا پہاڑ | دولت آباد کے قلعہ میں بارہ دری کے اوپر بالا حصار میں ایک بھاری توپ رکھی ہے اس کا نام "کالا پہاڑ" ہے، یہ توپ بارہ فیٹ ساڑھے آٹھ انچ لمبی ہے، کان کے پاس کا دور چار فیٹ دس انچ اور دہانہ کا دور تین فیٹ ساڑھے نو انچ ہے، افسوس ہے کہ ان توپوں پر کوئی تحریر نہیں ہے، مگر ان کی ساخت اور طرز سے نظام شاہی توپوں کا قیاس ہوتا ہے،

چار گزی | قلعہ گلبرگہ میں ایک برج پر تین توپیں ہیں، ایک توپ چار گزی ہے، اس پر چہار منی عادلشاہی کندہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا گولہ چار من عادلشاہی کا ہوتا تھا، بقیہ دو توپیں ۱۴-۱۴ فیٹ لمبی ہیں اور انکا قطر سوا سو فیٹ کا ہے،

یہ سب توپیں غالباً عادل شاہی عہد حکومت میں بیجاپور میں تیار کی گئیں،

عادلشاہی ۱۲ گزی توپ | گلبرگہ کے نورس برج پر ایک توپ رکھی ہے، جس کو بارہ گزی کہتے ہیں، اس کا طول اٹھارہ ہاتھ ہے، اس کے پاس ہی سنگ سرخ پر جو کتبہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم عادلشاہ کے عہد میں ملک صندل نے ۱۰۳۴ھ میں تیار کی تھی،

سکندر برج پر جو توپ رکھی ہوئی ہے، وہ سکندر عادل شاہ کے عہد ۱۰۸۳ھ کی ہے، غرض ان تمام برجوں پر کُل ۲۶ توپیں رکھی ہوئی ہیں،

قلعہ مدگل میں بہت سی توپیں تھیں، جن میں سے اکثر بڑی توپیں انگریز اٹھا لے گئے، کچھ حیدرآباد

چلی گئین، فی الحال پانچ سات توپین پڑی ہین، جن کا پیمانہ حسب ذیل ہے،

	طول	دہانہ
۱-	۹ فیٹ ½۹-۱ انچ طول	۲ فیٹ ½۵-۱ انچ دہانہ
۲-	۳ 〃 ۹ 〃 〃 〃 〃	۴ 〃 ½۷ 〃 〃
۳-	۱۲ 〃 ۹ 〃 〃	۵ 〃 ½۷ 〃 〃
۴-	۱۲ 〃 ۷ 〃 〃	۴ 〃 ۱۰ 〃 〃
۵-	۸ 〃 〃 〃	۳ 〃
۶-	۴ 〃 〃 〃	۴ 〃 ½۷ 〃 〃
۷-	۴ 〃 〃 〃	

ان مین سے اوّل الذکر چار توپین پتر جوڑ کر تیار کی گئی ہین، باقی ڈھلی ہوئی ہین،

قلعہ نل درگ (واقع مملکت نظام) کے ایک برج پر دو توپین تانبے کی بنی ہوئی ہین، اور اسی کے ایک چھوٹے برج پر ایک سیاہ دھات کی توپ ہے، سنگرام برج پر ایک پیچ رسی توپ ہاتھی کی شکل کی ہے، اور دوسری مگر کی شکل کی، قلعہ کے تمام برجون پر بارہ بڑی بڑی اور ۳۲ چھوٹی توپین ہین،

نظام شاہی توپین ملک میدان

بیجاپور دکن کے شرزہ برج پر ایک مشہور توپ "ملک میدان" نامی رکھی ہے، "اللہ قصاب" نامی توپ کے بعد یہ سب سے بڑی توپ ہے، اور اس کی ساخت دوسری توپون سے بالکل مختلف ہے، یہ توپ ترنج رسی ڈھلی ہوئی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا طول تو کم ہے، مگر جوف بہت بڑا ہے جس سے دیکھنے مین چھوٹی معلوم ہوتی ہے اور جس سے ظاہر ہے، کہ اس کا گولہ دور نہین جا سکتا، اس کا دہانہ اژدہے کے سر جیسا ہے، جو جبڑا پھیلائے ہوئے ہے، اس کے دانتون کے درمیان چھوٹے چھوٹے دو ہاتھی دہانے کے دائین اور بائین طرف بنے ہوئے ہین، اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے :-

"عمل محمد حسن رومی"

ابو الغازی نظام شاہ خادم اہل بیت رسول اللہ

اللہ ماسواہ فی ۳ سنہ جلوس والا مطابق ۱۰۹۷ھ

شاہ عالمگیر غازی بادشاہ دین پناہ آن کہ داد عدل داد و ملک شاہان را گرفت

فتح بیجاپور کرد بہر تاریخ ظفر...... رو نمود اقبال گفتہ "ملک میدان را گرفت"

یہ کتبہ اس وقت کا ہے، جب عالمگیر بادشاہ نے بیجاپور فتح کیا تھا، ورنہ درحقیقت یہ توپ احمد نگر مین نظام شاہ کے عہد مین ڈھالی گئی، اور جس جگہ تیار کی گئی تھی، وہ اب بھی موجود ہے، احمد نگر سے لاکر قلعہ پرینڈہ پر چڑھائی گئی تھی، جو اس زمانہ مین نظام شاہ کے قبضہ مین تھا، ۱۶۳۲ء مین جب محمد عادل شاہ نے اس قلعہ کو فتح کر لیا، تو بادشاہ نے اس توپ کو بیجاپور منتقل کرنے کا حکم دیا، جو وہان سے ایک سو میل دور تھا، اور یہ بھاری اور وزنی توپ اتنے فاصلہ سے بیجاپور لائی گئی، اور ۱۰۴۲ھ مین شرزہ برج پر چڑھائی گئی، اس کا وزن چار سو من طول ۱۴ فیٹ چار انچ، دہانہ دو فیٹ چار انچ، اور کان کے پاس کا قطر دو فیٹ دو انچ ہے، اس کا جوف اس قدر وسیع ہے کہ اس مین آدمی پالتی مار کر نہ صرف بیٹھ سکتا ہے، بلکہ پگڑی بھی باندھ سکتا ہے، یہ توپ محمد بن حسن رومی نے ۹۵۶ھ ۱۵۴۹ء مین تیار کی،

مشین گن

دہانہ اور توپ کے آخری حصہ کی پیمایش سے معلوم ہوتا ہے کہ دہانہ کے پاس گولہ کے علاوہ ہوا کے لئے قریب قریب ایک انچ کی گنجایش چھوڑی گئی، یہ توپ گولہ ماننے کے کام کی نہ تھی بلکہ اس سے وہ کام لیا جاتا تھا، جو آج کل مشین گن سے لیا جاتا ہے، یعنی جب غنیم نزدیک آجاتا اور تھوڑے فاصلہ پر ہوتا، تو اس مین پیسے بھر کر جو تھیلیون مین بندھے ہوتے، دشمن پر چھوڑتے تھے جس سے اُن کے بدن چھلنی ہو جاتے،

دکن کی مشہور جنگ تالی کوٹہ ۹۷۲ھ مین جب بیجانگر کی فوج نے نظام شاہ پر یورش کی تو اسی مشین گن سے کام لیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر مین اس توپخانہ کے سامنے پانچ ہزار سپاہیون کی لاشین ڈھیر ہوگئین، یہ دیکھ کر غنیم پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سپاہی منتشر ہو کر بھاگ نکلے،

اردن صاحب نے اپنی کتاب "نظام فوج" مین لکھا ہے کہ ملک میدان کے گولہ کا وزن ۲۲۳۶ پونڈ یعنی ۳ من ۲۳ سیر تھا[1]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس توپ سے گولہ اندازی کا بھی کام لیا جاتا تھا، اور اس کی تائید اقبال نامہ سے بھی ہوتی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے،

روزے در ایام محاصرہ احمد نگر توپ
ملک میدان را کہ از غایت اشتہار محتاج
بہ تعریف و توصیف نیست بجانب اردو
شاہزادہ مجرا گرفتہ آتش دادند، غلولہ قریب
بدولت خانہ ایشان رسید، از آنجا باز گشتہ
بہ پہلوے خانہ قاضی بایزید کہ از
مصاحبان شاہزادہ دانیال بود افتاد،
اتفاقاً اسپ قاضی سہ چہار گز دور تر
از آنجا بستہ بود، بمجرد رسیدن غلولہ بزمین
از صلابت صداے آن زبان اسپ
قاضی از بیخ کندہ شدہ بیرون افتاد،
غلولہ اش از سنگ بود، بوزن دہ من

ایک دن احمد نگر کے محاصرہ کے
زمانہ مین مشہور توپ ملک میدان
شاہزادہ کے لشکر کی طرف چھوڑی
گئی، اس کا گولہ دولت خانہ کے قریب
پہنچا، وہان سے گھوم کر قاضی بایزید
کے گھر کے پاس جو شاہزادہ دانیال
کے مصاحبون مین تھا، گرا، اس کے
گرنے کے ساتھ ہی اس کی خوفناک
آواز سے قاضی صاحب کے گھوڑے
کی زبان جڑ سے کٹ کر باہر آ پڑی،
گولہ پتھر کا تھا جس کا وزن دس من
اکبری تھا جس کے اسّی من خراسانی

[1] نظام فوج مصنفہ اردن صاحب لندن ص ۱۲۷،

متعارف حال (اکبری) کہ ہشتاد من
بوزن خراسان باشد، و توپ مذکور بشانی
کلان است کہ شخصے متوسط الخلقت درون میان
آن درست می تواند نشست[1]

ہوتے ہین، توپ اس قدر بڑی ہے کہ
ایک شخص سیدھے طور پر اس کے درمیان
بیٹھ سکتا ہے،

اس بیان سے ظاہر ہوا کہ عہد اکبری و جہانگیری مین یہ توپ کار آمد رہی ہے، اور اس وقت تک نظام شاہی اس پر قابض تھے، اور اس سے گولہ اندازی کا کام لیتے تھے، اس سے اردن صاحب کے قول کی تصحیح بھی ہوگئی یعنی کہ اس کا گولہ دس من اکبری کا ہوتا تھا، ان دونون بیانون مین تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس توپ سے دونون کام لئے جاتے ہون گے، دور کی مار کے لئے گولہ استعمال مین آتا ہوگا جیسا کہ اقبال نامہ سے ظاہر ہوتا ہے، اور نزدیک کے لئے پیسہ ڈال کر دشمنون پر چلاتے ہون گے، جس سے دشمنون کا بدن چھلنی ہو جاتا ہوگا،

دوسری توپون کی طرح یہ بھی چبوترہ پر رکھی ہے، جس گاڑی پر یہ توپ چڑھائی جاتی تھی، اس کا پتہ نہین ہے، ممکن ہے سڑ گل گئی ہو، یا مرہٹہ گردی مین غائب ہوگئی ہو، اور جس طرح بیجاپور کی ایک امینٹ پونہ پہنچائی گئی، یہ بھی پہنچ گئی ہو، اب یہ توپ دو بڑے شہتیرون پر رکھی ہوئی ہے،

اس توپ کے نیچے مین آہنی چول اور وہ چار کڑیان بھی ہین، جن پر اس گاڑی کے پہیے چکر کھاتے تھے، توپ کے پیچھے نصف دائرے کی ایک مضبوط دیوار بھی بنی ہوئی ہے، جو توپ کے تصادم کو روکتی تھی،

ملک میدان کے جوڑ کی دو توپین اور بھی ہین، جن مین سے ایک قلعہ بیدر کے مشرقی برج پر اور دوسری قلعہ دولت آباد کے لاحصار برج پر رکھی ہے، لیکن یہ دونون ملک میدان سے کم تر ہین، یہ خیال بھی صحیح نہین ہے کہ اس نام کی صرف یہی ایک توپ ہے، قلعہ پرینڈہ مین بھی دو جوڑوان توپین ہین،

[1] اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۶۳ مطبوعہ کلکتہ،

جن مین سے ایک کا نام "ملک میدان" اور دوسرے کا "اژدھا پیکر" ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ توپ ساز نے جو سانچہ تیار کیا تھا، اس سے صرف دو ہی توپین ڈھالی جا سکین جن مین سے ایک یہی ملک میدان بیجاپوری ہے، اور دوسری "کڑک بجلی" نامی تھی، جنگ تالی کوٹہ مین یہ دونون مصروف پیکار رہین، بدقسمتی سے واپسی کے وقت "کڑک بجلی" دریائے کرشنا مین غرق ہو گئی، یہ توپ ۹۵۳ھ مین محمد بن حسن نے تیار کی تھی،

ملک میدان ہر طرح سے فاتح ثابت ہوئی، میدان جنگ مین کامیاب رہی، دریا مین غرق ہونے سے بچی، اور آخری دفعہ ایک انگریز کے حماقت آمیز حکم سے بھی محفوظ رہی،

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۴ء مین ستارہ کے کمشنر نے حکم دیا کہ تمام قدیم اور نادر چیزین جو بیجاپور کے قلعہ مین پڑی ہین، نیلام کر دیجائین، چنانچہ اُن کے ساتھ یہ توپ بھی نیلام کر دی گئی، ۱۵۰ روپیے قیمت لگی،

نیلام کنندہ تحصیلدار صاحب کو یہ قیمت بہت کم معلوم ہوئی، اور شاید کسی سمجھدار آدمی کے سمجھانے سے انھون نے یہ رپورٹ کی کہ اس سے زیادہ دام نہین لگتے اور لوگ اس قدیم یادگار کو اس طرح ضائع کرنا پسند نہین کرتے، اس رپورٹ پر کمشنر موصوف نے اپنا حکم واپس لیا، اس کے بعد یہ تجویز کی گئی کہ اس توپ کو کلکتہ میوزیم مین رکھا جائے، مگر بعض وجوہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا، اور اس طرح اس توپ کو روحانی فتح بھی حاصل ہوئی،

کہتے ہین کہ یہ توپ ملک میدان سُرخ رنگ کی تھی، اور ہندو (عوام) اس کی پوجا کرتے تھے،

کھڑی عادلشاہی | بیجاپور کے حیدر برج پر دو توپین رکھی ہین، یہ دونون اتنی لمبی تھین کہ جو کسی دوسرے معمولی بُرج پر نہین آسکتی تھین، اس لئے خاص طور پر حیدر برج تیار کیا گیا، ان دونون کی لمبائی، اور چھوٹے دہانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دور کی مار کے لئے تیار کی گئی تھین، اس وقت بھی ان دونون

کے اچھلنے کی روک کی، دیوارین اور گاڑی کے پھرانے اور پلٹانے کی چاکاریان موجود ہین، ان مین سے "لم چھڑی" ۳۰ فٹ آٹھ انچ لمبی ہے، اور دہانہ کا قطر ایک فٹ ہے،

یہ توپ آہنی کڑیون سے بنائی گئی ہے، اور اوپر سے لوہے کی موٹی موٹی پٹیون سے کس دیا گیا ہے، توپ کے طول مین اس طرح کے ڈیڑھ سو حلقے چمائے گئے ہین، اور مضبوطی کے لئے توپ کی گدی پر دہرے حلقے چڑھائے گئے ہین، اور دہانہ پر بھی خوبصورتی اور گگز نکالنے کے واسطے چند زائد حلقے لگا دیئے گئے ہین۔

دل کھندل عادل شاہی | علی مرد برج پر یہ توپ رکھی ہوئی ہے، اس کا نام دل کھندل ہے، یہ توپ کسی اور مقام پر تھی، جمادی الآخر ۱۰۹۲ھ مین سکندر عادل شاہ کے حکم سے ملک صندل نے اس کو بیجاپور بھیجا، جیسا کہ ایک کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے،

دوازدہ امام عادلشاہی | اس توپ کا نام دوازدہ امام ہے، یہ پہلے بیجاپور کے کسی دروازہ پر تھی، اب بیجاپور کے میوزیم کے میدان مین رکھی ہوئی ہے، یہ توپ بہت بڑی اور قابل دید ہے، اس پر علاوہ اسمائے حسنیٰ کے بارہ امامون کے نام بھی دہانہ پر کندہ ہین، یہ توپ ابراہیم عادل شاہ کے عہد ۹۸۵ھ کی ہے، اور غالباً بیجاپور ہی مین عادل شاہیون کے حکم سے بنائی گئی ہے، اسی سے اس پر بارہ امامون کے نام درج ہین،

لنڈے قصاب | اس نام کی یہ دوسری توپ ہے جو بیجاپور کے نعمت برج پر ہے، یہ سب سے بڑی توپ ہے، ملک میدان بھی اس کے مقابلہ مین دوسرے نمبر کی توپ ہے،

یہ توپ اکیس فیٹ سات انچ لمبی ہے، اس کے وسط کا دور چار فیٹ چار انچ، اور دہانہ کا دور چار فٹ پانچ انچ ہے، خود دہانہ ایک فٹ ۱/۲ ۱۰ انچ ہے، اس کا وزن ۴۷ ٹن یعنی ۱۲۶۵ من ہے، اسکی ساخت بھی لم چھڑی توپ کی جیسی ہے، اس توپ کے پاس ہی ایک بہت بڑی دوسری نا تمام توپ کا سانچا پڑا ہوا ہے،

مغلیہ توپین | جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ بابر بادشاہ نے ایک کارخانہ توپ سازی کا مصطفےٰ خان رومی

کے ماتحت قائم کیا تھا، ابتدا میں اس کارخانہ کی بنی ہوئی توپیں بہت زیادہ کارآمد نہ تھیں، ان کا گولہ صرف چھ قدم تک جاتا تھا، لیکن آخری دنوں میں توپ سازی نے کافی ترقی کرلی تھی، اوران کا گولہ ۱۶۰۰ سو قدم تک جانے لگا تھا، بابر کا دماغ ایسے کاموں کے لئے بہت موزون تھا، اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہ جاتا، تو اس کا توپخانہ ہندوستان میں بے نظیر ہوتا، لیکن اس کی موت نے اس کا موقع نہ دیا،

ہمایون کو اول تو کبھی اطمینان قلب سے سلطنت کرنا نصیب نہیں ہوا اور دوسرے اس کے دماغ میں ایجاد کی قابلیت نہیں تھی، لودی اور سوری امراپر جو فتوحات اس نے حاصل کین وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتی ہین، اس کا مقابلہ جب دو منظم سلطنتوں سے ہوا تو کسی میں اس کو کامیابی حاصل نہین ہوئی؛ پہلا مقابلہ سلطان بہادر گجراتی سے ہوا تھا، جس نے توپوں کا قلعہ بنا کر فوج کو محفوظ کرنا چاہا تھا، ہمایون کے پاس کوئی ایسا توپخانہ نہ تھا، جو اس کے توپ خانہ کا مقابلہ کرسکتا، اگر رومی خان میر آتش نے سلطان بہادر شاہ سے غداری کی ہوتی تو شاید ہمایون کو دہلی واپس جانا بھی نصیب نہ ہوتا، چنانچہ رومی خان نمک حرام کے چلے جانے پر سلطان بہادر شاہ نے گجرات ہمایون سے واپس لے لیا،

دوسری جنگ شیر شاہ سے ہوئی، جس میں ہمایون نے بہادر شاہ کا توپ خانہ استعمال کیا، جس کو مال غنیمت میں اس نے حاصل کیا تھا، مگر کچھ اپنی سوء تدبیری اور کچھ بھائیون کی غداری سے اسے یہان بھی قسمت نے کامیاب نہ ہونے دیا،

جنگ قنوج مین ہمایون نے جو توپ خانہ استعمال کیا، اس مین ۷۰۰ توپیں تھین ان مین سے ۲۱ بڑی تھین جن کو ۱۲، ۱۶ بیل کھینچتے تھے، باقی چھوٹی تھین جن کو آٹھ آٹھ بیل لیجاتے تھے،[1]

---

[1] نظام فوج مغفر ارون صاحب مطبوعہ لندن،

اکبر بادشاہ نے جہان اپنے دادا بابر کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی وراثت میں پائی تھی، وہین اس کا دماغ بھی ایجاد کرنے میں بے نظیر تھا، اس لئے اس کے عہد مین توپخانہ کو زیادہ ترقی ہوئی اس کے کارخانہ مین مختلف قسم کی توپین بنائی جاتی تھین، ان مین سے بھاری بھی ہوتی تھین، اور ہلکی بھی بعض اس قدر ہلکی ہوتی تھین کہ ان کو ایک آدمی آسانی سے اٹھا کر لے جاسکتا تھا، ان مین مندرجۂ ذیل قسم کی توپین تھین، (۱) برجی (۲) فیل کش (۳) گاوکش (۴) مردم کش،

۱- **برجی توپ**: بہت وزنی اور بڑی مار کی توپ ہوتی تھی، اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا مشکل ہوتا تھا، اس لئے زیادہ تر قلعہ کے برجون پر رکھی جاتی تھی، اور غنیم کے محاصرہ اور حملہ کے وقت بڑی کارآمد ثابت ہوتی، اس کا گولہ بھی زیادہ وزنی ہوتا تھا، اکبری عہد مین آگرہ کے برج پر اسی قسم کی توپ تھی جس کی تصویر آئین اکبری مین ابوالفضل نے دی ہے،

۲- **فیل کش**: یہ بہت وزنی ہوتی تھی، اس کو ہاتھی کھینچتے تھے، یہ قلعہ شکن اور میدانی دونون قسم کی ہوتی تھی،

۳- **گاوکش**: ان کو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بیل کھینچتے تھے انمین بھی بعض وزنی اور بعض ہلکی ہوتین، ابوالفضل نے لکھا کہ بعض اس قدر وزنی تھین کہ ہزار بیل ان کو لیجاتے تھے، اس کی تصدیق ان بیانات سے ہوتی ہے جن کو سیاحون نے اپنے سفرنامہ مین لکھا ہے، اس کا ذکر عنقریب آئے گا، لیکن اکثر ایسی ہوتی تھین کہ دو چار جوڑی بیل بآسانی جہان چاہتے لیجاتے،

۴- **مردم کش**: یہ توپ چھوٹی اور ہلکی ہوتی تھی ایک آدمی آسانی کے ساتھ سر پر رکھ کر لیجا سکتا تھا، اس توپ کا نام "نرنال" تھا، بار برداری کی سہولت کے خیال سے ایسی توپین بکثرت بنائی جاتی تھین، اور ان کا استعمال بہت زیادہ فوج مین ہوگیا تھا، نرنال ایسی بھی ہوتی تھین، جن کا وزن کچھ زیادہ ہوتا تھا، اور کئی کئی آدمی مل کر اٹھاتے تھے، بادشاہ کی ہمرکابی مین اکثر ایسی ہی توپین رہتی تھین، جن کو حاضر توپ

کہتے تھے،

۵- **اکبری مشین گن**: احمد نگر کے نظام شاہیون نے بعض توپین ایسی ایجاد کی تھین، جن مین ضرورت کے وقت پیسے بھر کر غنیم پر چھوڑتے، اور جو موجودہ مشین گن کی طرح غنیم کا صفایا کر دیتی تھین، یہ گویا مشین گن کا ابتدائی "تخیل" تھا، اکبری عہد مین اس تخیل نے عملی صورت اختیار کر لی، اور ایک طرح کی مشین گن ایجاد کی گئی، اس مین چھوٹی چھوٹی سترہ توپین ایک ساتھ اس طرح بنائی گئین کہ ایک فتیلہ سے سب کے منہ کھل جاتے، اور بہ یک وقت سترہ فیر ہوتے، اور یہ ہلکی اس قدر تھین کہ ایک ہاتھی باسانی کھینچ سکتا تھا،[1]

یہ ایجاد آج سے ۳۰۰ سو برس پہلے کی ہے، جب کہ غالباً یورپ مین اس کا تخیل بھی نہ تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا موجد ابو الفتح گیلانی ہے،

ساخت کے اعتبار سے بھی یہ توپین مختلف قسم کی تھین (۱) ڈھلی ہوئی ہوتین اور بغیر گاڑی کے استعمال کیجاتین، ان کو اٹھا کر کسی بلند جگہ پر یا دو شہتیرون کو کھڑا کرکے اس پر نصب کر دیتے، لیکن ان کا استعمال آہستہ آہستہ کم ہوگیا،

۲- یہ توپ گاڑی پر اس طرح جمی ہوتی تھی کہ اس سے الگ نہین کر سکتے تھے، اور گاڑی پر جہان چاہتے لیجا سکتے تھے، اس قسم کی توپین زیادہ تر وزنی ہوتی تھین، اور قلعہ شکنی کے کام مین ان کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا، ان کو ہاتھی یا بیل کھینچتے تھے، میدانی لڑائیون مین بھی ان کا استعمال ہوتا تھا، اور بہت کار آمد ثابت ہوتی تھین،

۳- یہ توپ بھی گاڑی پر ہوتی تھی، مگر اتنی ہلکی ہوتی تھی کہ جہان چاہتے گاڑی سے الگ کرکے استعمال کر سکتے تھے، اور پھر جب ضرورت ہوتی، گاڑی پر رکھ کر کام چلاتے، یہ تمام قسمین ڈھلی

---

[1] آئین اکبری جلد اول ص ۸۲ نولکشور لکھنؤ،

ہوتی تھین،

۴- بعض ایسی توپین بھی تھین جن کے ٹکڑے الگ ہو سکتے تھے، اور بوقت ضرورت گاڑیون پر رکھکر اُن کو جوڑ لیا جاتا، اس لئے بڑی وزنی توپون کو ٹکڑے کرکے جہان چاہتے لیجاتے، اور کسی قسم کی دقت نہ محسوس ہوتی، ان کی ایجاد سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ شکست یا تنگیٔ وقت کے باعث جب کہ غنیم سر پر آگیا ہو، وزنی توپون کو اپنے ساتھ نہ لیجا سکتے تھے، ایسی صورت مین یا تو ان کو کیل مار کر بیکار کر دیتے تھے، یا پھر نصیب دشمنان ہو جاتین، ان توپون کی ایجاد سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ منتقل ہو سکتی تھین، اور غنیم کے ہاتھ لگنے سے محفوظ رہجاتین،

یہ جوڑ دار توپین مختلف سائز کی ہوتی تھین، بعض کے جوڑ نو یا دس ہوتے، بعض کے اس سے کم، کم سے کم تین جوڑ ہوتے تھے، ایک آگے کا حصہ، دوسرا اوسط، اور تیسرا آخر کا، اس کو وصل کرکے پیچ کے ذریعہ سے کس دیتے تھے،

ان توپون کے گولے بھی مختلف وزن کے ہوتے تھے، ۲۵-۳۰ سیر سے لیکر بارہ من وزن تک کے گولے ان مین استعمال کئے جاتے تھے، یہ گولے پتھر اور لوہے کے ہوتے، اکبری عہد کے توپ سازی کے کارخانہ کے عہدہ دار کو میر آتش (داروغہ توپخانہ) کہتے تھے، اور اس کا شمار منصب دارون مین ہوتا، اور دوسرے عہدہ دارون کے طرح اُن کی بھی بڑی عزت افزائی ہوتی تھی، اور خلعت و جاگیر سے سرفراز کئے جاتے تھے، اس زمانہ مین عام سپاہیون کی تنخواہ دس روپیہ تک ہوتی تھی،[1] (باقی)

---

[1] آئین اکبری ص ۸۳ ج اول نولکشوری،

عربی نظم و نثر کی تاریخ

نثر

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۲)

نثر دورِ جاہلیت

اہلِ جاہلیت کی نثر دو قسمون مین منقسم ہے :-

۱- ایک تو ان کی عام بول چال کی زبان جس مین وہ روزمرہ گفتگو کرتے تھے،

۲- دوسری وہ نثر جو لفظی تراش وخراش کے ذریعہ سے ادبی قالب مین ڈھالی جاتی تھی، اور اُس کے ذریعہ جذبات کو ابھارا جاتا تھا، لیکن اس ادبی نثر کا درجہ شعر سے کم تھا، کیونکہ شعر خیال کی اور نثر عقل کی پیداوار ہے، اور ہر قوم کے ابتدائی زمانہ مین خیال عقل پر غالب رہتا ہے، اس کے ساتھ اس قسم کی ادبی نثر سے زیادہ تر تحریر وکتابت مین کام لیا جاتا ہے، اور جاہلیت کے زمانہ مین اہلِ عرب مین پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے، ان تمام باتون کے ساتھ اہلِ عرب کی نثر کا ذخیرہ ہم تک بہ نسبت شعر کے بہت کم پہنچا ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت کا ادبی سرمایہ ہم تک بذریعہ روایت کے پہنچا ہے، اور قوت حافظہ بہ نسبت نثر کے نظم کو زیادہ محفوظ رکھتی ہے، اور اگر کہین غلطی کرتی ہے، تو ایک لفظ یا دو ایک فقرے مین کرتی ہے، باقی اصل قصیدہ اپنی اصلی صورت مین قائم رہتا ہے، لیکن نثر کی یہ حالت نہین ہے،

بہرحال اہلِ جاہلیت کی ادبی نثر کا جو سرمایہ ہم تک بذریعہ روایت کے پہنچا ہے، وہ چند قسمون مین منقسم ہے،

۱- چند قصے جو زیادہ تر کتاب الاغانی مین مذکور ہین اُن کے تاریخی حالات اور جنگ و مفاخرت سے تعلق رکھتے ہین لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی روایت بالمعنی کی گئی ہے، اور راوی نے واقعات کو اپنے الفاظ مین بیان کر دیا ہے، گیارہ عورتون کا ایک قصہ صحیح بخاری مین بھی مذکور ہے جس مین سب نے اپنے اپنے شوہرون کے حالات بیان کئے ہین لیکن اُن کی زبان اس قدر مشکل ہے کہ اس قصہ کی مستقل شرحین لکھی گئی ہین، ان مین سے چند عورتون کے فقرے یہ ہین -

۱- زوجی لحم جمل، غث علی راس جبل، لا سهل فیرتقی ولا سمین فینتقل"،

۲- زوجی العشنق ان انطق اطلق وان اسکت اعلق،

۳- زوجی ان اکل لف وان شرب اشتف وان اضطجع التف ولا یولج الکف لیعلم البث

۴- زوجی رفیع العماد، طویل النجاد، عظیم الرماد، قریب البیت من الناد"،

کاہنون کے چند فقرے جو حدیث کی کتابون مین مذکور ہین، وہ بھی اسی طرح مسجع و مقفی ہین،

۲- دینی وعظ و پند، اس سلسلہ مین قس بن ساعدہ کے چند دینی مواعظ نقل کئے گئے ہین جن کے چند فقرے یہ ہین :-

"ایها الناس اسمعوا و عوا واذا وعیتم فانتفعوا، انه من عاش مات ومن مات فات، وکل ما هو آت آت مطر و نبات،

لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور جعلی ہین، ان کے رواۃ عموماً ناقابلِ سند بلکہ کذاب ہین، تاہم ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی انشاپردازانہ نثر عموماً مسجع و مقفی ہوتی تھی، اور قرآن مجید کی مسجع و مقفی آیتون سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ مین یہی طرز موثر اور مقبول تھا،

۳- تقریر و خطابت جس کی ترقی آزاد اور خودمختار قومون مین خاص طور پر ہوتی ہے، بالخصوص جب ان قومون مین باہم جنگ و خونریزی کا بازار گرم رہتا ہے، تو اس کو اور بھی زیادہ ترقی ہوتی ہے، اور زمانۂ جاہلیت مین یہ دونون باتین نہایت شدت سے پائی جاتی تھین، اس لئے وہان فصیح و بلیغ خطیبون کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا تھا، اور شعرا کی طرح ہر قبیلہ اپنے خطیبون پر بھی فخر کرتا تھا،

دورِ جاہلیت کی نثر مین یہ خطبات زیادہ تر نقل کئے گئے ہین، اور وہ اکثر دو باتون سے تعلق رکھتے ہین:-

۱- منافرت یعنی دو شخص یا دو قبیلے باہم مفاخرت کرتے تھے، اور اپنے اپنے مفاخر بیان کرنے کے بعد اُن کو ایک حکم کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے پیش کرتے تھے،

۲- وفد مختلف اغراض سے اہلِ عرب کے وفود امرا و سلاطین کی خدمت مین حاضر ہوتے تھے، اور تقریر و خطابت کے ذریعہ سے اپنے اغراض کو اُن کے سامنے نہایت انشاپردازانہ الفاظ مین پیش کرتے تھے،

ان دونون امور کے متعلق اُن کے جو خطبات منقول ہین، ان مین بڑا زور و اثر پایا جاتا تھا، بہت سے معانی تھوڑے سے الفاظ مین بیان کئے جاتے تھے، ابتدائے اسلام مین خلفائے راشدین وغیرہ نے جو خطبے دئیے ہین، وہ معانی و مطالب کے لحاظ سے اگرچہ اسلام سے متاثر ہین، لیکن ان کا اسلوب بالکل دورِ جاہلیت کے خطبات کا ہے،

۴- ضرب الامثال، ضرب المثل کے معنی یہ ہین کہ کسی قوم کے تجربات کو چند مختصر الفاظ مین بیان کردیا جائے، اور اس کا امتیازی خاصہ یہ ہے کہ وہ صرف شعرا جیسے ترقی یافتہ گروہ کی ذہنیت کا اظہار نہین کرتی، بلکہ پوری قوم کی ذہنیت کو ظاہر کرتی ہے،

قومون کی اجتماعی زندگی کے اختلاف سے اُن کی ضرب المثلون مین بھی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے، مثلاً ساحلی قومون کی ضرب الامثال بحری زندگی سے اور صحرائی قومون کی ضرب الامثال صحرائی زندگی کے ماحول سے پیدا ہوتی ہین، اس لئے ان مین ان کے اثرات ہوتے ہین، اہلِ عرب کے یہان ضرب الامثال کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، جن کی مختلف قسمین تھین، ایک تو حکیمانہ تھین، اور اس قسم کی ضرب الامثال نظم مین زہیر بن ابی سلمیٰ کے یہان اور نثر مین اکثم بن صیفی کے یہان بکثرت ملتی ہین، دوسری قسم کی ضرب الامثال وہ تھین، جو ہمرنگ واقعات سے تعلق رکھتی تھین، عربی ضرب الامثال بہت سی کتابون مین جمع کی گئی ہین، جن مین سب سے زیادہ مشہور میدانی کی کتاب الامثال ہے، لیکن یہ افسوسناک بات ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی ضرب الامثال علحدہ علحدہ نہین جمع کی گئی ہین، بلکہ زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام کی ضرب الامثال باہم گڈمڈ ہوگئی ہین، اس لئے کبھی تو آسانی سے اُن کے زمانہ کا پتہ چل جاتا ہے، اور کبھی نہین چلتا، اور یہ دشواری زیادہ تر حکیمانہ ضرب المثلون مین پیش آتی ہے،

نثر دورِ اسلام

خطابت انشاپردازانہ نثر کی ایک قسم ہے، جس کے ذریعہ ایک شخص جماعت پر اثر ڈالتا ہے اور اس کو ایک کام پر ابھارتا ہے، بہت سے محرکات اور بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہین، جہان بڑے بڑے قصائد اور بڑے بڑے رسالے بیکار ہو جاتے ہین، اور صرف تقریر و خطابت سے کام چلتا ہے، اس قسم کے محرکات زیادہ تر کسی دینی یا سیاسی یا اجتماعی انقلاب کے زمانہ مین پیدا ہوتے ہین، چونکہ اسلام اور اسلام کی اشاعت دنیا کا سب سے بڑا انقلاب تھا، جس نے مختلف مذاہب کو منسوخ کر دیا، پرانے اجتماعی نظام کی بنیادین ہلا دین، اور بہت سی قومون کی سلطنتون کو مٹا کر ایک دوسری

قوم کی سلطنت قائم کر دی، اس لئے اسلامی دور مین خطابت کی ترقی کے بہ کثرت محرکات پیدا ہو گئے، مثلاً:-

(۱) اسلام ایک ان پڑھ قوم مین آیا، اور اس کی اشاعت ایک ایسے پیغمبر کے ذریعہ سے ہوئی جو خود اس قوم کی طرح امی تھا، اور ایک ان پڑھ قوم پر سب سے زیادہ اثر خطابت کا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خلفاء اور آپ کے فوجی سردارون نے اپنی دعوت مین صرف خطابت سے کام لیا،

(۲) اسلام سے پہلے اور اسلام کے آغاز مین اہلِ عرب کے نزدیک خطابت ایک مقبول عام چیز تھی، اور شاعری کسب مال کا ذریعہ بن کر ایک ذلیل چیز ہو گئی تھی اس کے ساتھ شاعری کا میدان محدود تھا، اور خطابت کے ذریعہ سے ہر قسم کے خیالات ظاہر کئے جا سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اسلام کی تائید مین جو خطبے دیئے، اہلِ عرب پر ان کا شدت کیساتھ اثر پڑا،

(۳) ابتدائے اسلام مین مسلمان بہت تھوڑے سے تھے، جن کو ایک جگہ آسانی کے ساتھ جمع کیا جا سکتا تھا، اور اس حالت مین خطیب کی شکل و صورت اس کی آواز اور اس کے اشارے انکو بہت زیادہ متاثر کر سکتے تھے لیکن ایک بہت بڑی جماعت جو بڑے بڑے شہرون مین پھیل جاتی ہے اس پر اثر ڈالنے کے لئے لکھے ہوئے فرمانون کی ضرورت ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ مین خطبات کے موضوع یہ ہوتے تھے،

۱- اسلام کی دعوت، توحید کی ترغیب، شرکت و بت پرستی سے اجتناب، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، غرض اسی قسم کے مختلف دینی امور، یہی وجہ ہے کہ ہر دینی اجتماع، مثلاً جمعہ، عیدین اور حج کے بعض مقامات مین خطبہ ایک ضروری چیز قرار دیا گیا ہے، اور اسی لئے داعیانِ اسلام سپہ سالارانِ فوج، خلفاء اور ان کے افسران سب کے سب زبان آور خطیب ہوتے تھے،

۲- فوجون کی روانگی کے وقت اُن کو آمادۂ جنگ کرنا اور مختلف فوجی معاملات کے متعلق انکو نصیحت کرنا،

۳- مختلف سیاسی معاملات مثلاً کسی پالیسی کی توضیح، کسی کی بیعت کی تائید، کسی سیاسی شبہہ کا ازالہ، اور کسی کی معافی کا اعلان،

ابتدائے اسلام مین خطابت کے اسلوب بیان مین بھی مختلف تغیرات پیدا ہوئے، الفاظ پر زور اور آسان استعمال کئے جانے لگے، سجع و قافیہ کی پابندی جیسا کہ کاہنون کا طریقہ تھا، باقی نہ رہی، خدا کی حمد و ستایش سے خطبات کی ابتدا کیجانے لگی، اور قرآن مجید کا اسلوب بیان اختیار کیا گیا، اور قرآن مجید کی بہ کثرت آیتون کا اقتباس کیا جانے لگا،

عربی شاعری عہد نبوت اور عہدِ صحابہ مین

زمانۂ جاہلیت مین اہلِ عرب کی شاعری، اُن کی بدویانہ زندگی کا آئینہ تھی، جس مین اُن کے احساسات، جذبات اور اخلاق و عادات کی تصویر نظر آتی تھی، لیکن جب اسلام نے اُن کی مذہبی، عقلی، اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی زندگی مین ایک عام انقلاب پیدا کر دیا تو عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ کی شاعری جاہلیت اور اسلام دونون کی زندگی کا مجموعہ بن گئی، اسی لئے اس دور کے شعراء کو مخضرمین کہا جاتا ہے، جس کے معنی اس چیز کے ہین، جو دو چیزون کے درمیان مین رکھی جاتی ہے، اور ان مین جو شعراء اسلام لائے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین رہ کر آپ کی حمایت کی اُن کے اشعار مین اسلامی رنگ نمایان ہے، مثلاً حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور کعب بن مالکؓ اسی قسم کے شعراء ہین، لیکن حطیہ وغیرہ کے کلام مین اسلامی رنگ واضح طور پر نمایان نہین، کیونکہ یہ لوگ صحرا مین بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے،

مشرکینِ مکہ کی عداوت نے اُن کو ہر ممکن طریقہ سے اسلام کے مقابلہ پر آمادہ کیا، اس لئے ان مین بہت سے شعراء ایسے پیدا ہو گئے، جو اس سے پہلے شاعری مین کوئی شہرت نہین رکھتے تھے، ان شعراء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو مین اشعار لکھے لیکن جب اسلام لائے، تو شاعری کو بالکل چھوڑ دیا،

عبد اللہ بن زبعری، ابوسفیان بن حارث، ضرار بن خطاب اور عمرو بن عاص اسی قسم کے لوگ تھے،

اس کے ساتھ بہت سے شعرا نے جب یہ آیت سُنی:-

"الشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ يَقُولُونَ

مَا لَا يَفْعَلُونَ"

تو شاعری کو نظر حقارت دیکھنے لگے، اصحاب معلقات میں لبید اسی قسم کے لوگون مین تھے، لیکن بہرحال اس دور نے شاعری کے اسلوب اور مقاصد پر مختلف قسم کے اثرات ڈالے جو حسب ذیل تھے،

۱- پرہیز گار شعرا نے شاعری کے ان تمام مقاصد کو چھوڑ دیا، جو گمراہی و ضلالت پیدا کرتے تھے مثلاً عریان غزل گوئی اور اس کے محرکات، تملق آمیز مداحی، ہجو و بدگوئی، فخاری، شراب و کباب، اور اس کے لوازمات، مثلاً مغنیہ عورتون کا رقص و سرود اور احباب کی رنگین صحبتون کا ذکر، سیر و شکار وغیرہ جن کو ایک مسلمان لہو و لعب کی چیز سمجھتا ہے، لیکن حطیہ جیسے رند مزاج یا عیسائی شعرا، کا کلام قریب قریب جاہلیت ہی کے طرز پر قائم رہا،

۲- دوسرے مسلمان شعرا نے مشرکین کی ہجوؤن کا جواب دینا شروع کیا اور اس مین یہ جدت پیدا کی کہ مشرکین پر کفر اور بت پرستی کا الزام لگایا، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کی ہجوؤن کی یہی خصوصیت تھی، لیکن جب تک کفار مکہ کفر کی حالت مین رہے، اُن پر اُن کی ہجوؤن کا بہت کم اثر پڑا، البتہ جب وہ مسلمان ہوگئے، تو وہ اُن کے لئے تیر و نشتر بن گئین،

۳- تیسرے یہ کہ شاعری سے دعوت اسلام کی تائید کا کام لیا گیا، اعمال صالحہ کی ترغیب دیگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے انصار کی مدح کی گئی، شہدار کے مرثیے لکھے گئے، اور لوگون کو جہاد پر آمادہ کیا گیا،

۴- چوتھے یہ کہ جن شعرا نے اسلامی فتوحات مین حصہ لیا تھا، انھون نے اپنے غلبہ اقتدار، مسلمان بہادرون کی شجاعت، قلعے، آلات جنگ، برف پوش پہاڑون، نہرون اور جہازون کے وصف مین اشعار کہے، لیکن اس قسم کے اشعار رجزیہ ہین اور مغازی کی کتابون مین زیادہ ملتے ہین،

الفاظ، معانی اور اسلوب بیان کے لحاظ سے قدیم اہل ادب نے مخضرمی شعرا کے دو گروہ قائم کئے ہین،

۱- ایک تو صحرا نشین شعرا مثلاً نجد و یمامہ کے بدو جن کے الفاظ مین جزالت و متانت اور اسلوب بیان مین تنوع ہے، لیکن اسی کے ساتھ غیر مانوس اور ثقیل الفاظ بھی پائے جاتے ہین، دور جاہلیت کے ممتاز شعرا انھی لوگون مین پیدا ہوئے ہین،

۲- دوسرے شہری شعرا جو مدینہ، مکہ، طائف اور حیرہ مین رہتے تھے، ان کے کلام مین تمدنی ترقی نے لطافت و نزاکت پیدا کر دی تھی، اور اہل مدینہ ان سب مین سب سے زیادہ شاعرانہ حیثیت سے ممتاز تھے، اور جن شعرا نے کفار قریش کی ہجوؤن کا جواب دیا، وہ مدینہ ہی کے رہنے والے تھے، البتہ ان شعرا نے دور جاہلیت کے الفاظ کی جزالت اور معانی کی قوت کو بالکل زائل کر دیا، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جو اسباب شاعرانہ جذبات مین اشتعال پیدا کرتے تھے، اسلام نے اُن سب کو ختم کر دیا، مثلاً عصبیت جاہلیہ، بغض و انتقام، ہجو و بدگوئی، رندی و شرابخواری وغیرہ پر شعرائے جاہلیت کے کلام کے زور و اثر کا دار و مدار تھا، اور اسلام نے ان سب کو یک قلم مٹا دیا تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب بیان نے خود شعرا کی نگاہون مین شاعری کی قدر و قیمت کو کم کر دیا تھا، اس لئے شاعری اپنے درجہ سے بالکل گر گئی، یہان تک کہ لبید عامری نے جو زمانۂ جاہلیت کا ممتاز شاعر تھا، قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت سے مبہوت ہو کر شعر ہی کہنا چھوڑ دیا، حضرت حسان بن ثابتؓ بھی زمانۂ جاہلیت کے نامور شاعر تھے، لیکن دور اسلام مین اُن کا کلام بھی اپنے پایہ سے گر گیا، البتہ جو شعرا، بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ قرآن مجید سے بہت کم متاثر ہوئے، اور ان کا کلام جاہلیت ہی

کے طرز پر قائم رہا، مثلاً حطیئہ اور کعب بن زہیر اسی قسم کے شاعر تھے، لیکن بہت سے نقادان فن شعر کا خیال ہے کہ مکہ، مدینہ اور طائف کے شعراء کا جو بچا کچھا کلام موجود ہے، وہ بالکل جعلی ہے، اور لوگون نے مذہبی اور تفریحی مقاصد سے اس قسم کے جعلی اشعار بنا کر ان شعراء کی طرف منسوب کر دیا ہے، لیکن بہرحال شعرائے مخضرمین بالخصوص صحابہ کا جو کلام موجود ہے، اس مین صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ، جنت و دوزخ، ثواب و عذاب، حشر و نشر اور بہت سے فرشتون اور پیغمبرون کا نام آیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پر قرآن و حدیث کا اثر پڑا ہے،

دور بنو امیہ ۴۰ھ سے ۱۳۲ھ تک

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت اور حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت تک نبوت اور خلفائے راشدینؓ کا دور ختم ہو گیا، اس لئے غزوات نبوی اور مرتدون کی جنگ کا زمانہ بھی گذر گیا، اور بہت سے ملک اسلام کے اقتدار مین آگئے، یہ اسلامی زندگی کا ایک نیا دور تھا، جس مین اہل عرب کی زندگی کے اطوار عقلی، مذہبی، اور سیاسی حیثیت سے دور جاہلیت کی زندگی سے مختلف ہو گئے، جس مین اہل عرب کے جذبات، احساسات اور اخلاق و عادات مین اسلامی روح کے ساتھ غلبہ و اقتدار کی آمیزش بھی شامل ہو گئی، اور شعر، رجز، خطبات، خطوط اور عہدنامون کے آئینے مین اس نئی زندگی کا پرتو سنجیدگی، وقار، دور اندیشی اور حق و مذہب کی تائید کی صورت مین نظر آنے لگا،

چونکہ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کا طویل زمانہ، سیاسی تدبر کا زمانہ تھا، اس لئے وہ دوست و دشمن دونون کے ساتھ عمدہ سلوک کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل عرب کی زندگی نے دو متضاد روش اختیار کی،

۱- ایک روش تو ان جاگیردارون کی تھی، جو فاتحین کی اولاد تھے، یہ لوگ بنو امیہ کی پارٹی مین شامل تھے، اور شام، جزیرہ اور مصر کے بعض حصون مین رہتے تھے، لیکن علویون کی پارٹی

جو ناگواری کے ساتھ بنو امیہ کی حکومت پر راضی ہو گئی تھی، عراق مین رہتی تھی، اور دونون پارٹیان تمدنی زندگی بسر کرتی تھین، اور غلامی کے رواج کی وجہ سے عجمیون کے ساتھ میل جول رکھتی تھین لیکن چونکہ ان لوگون کو مختلف لڑائیون مین حضرت امیر معاویہؓ کی حمایت اور ان کی جانب سے مدافعت کرنی پڑی تھی، اس لئے اس تمدنی زندگی مین فوجی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا، پھر حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید، مروان اور عبدالملک کے زمانہ مین جو لڑائیان ہوئین ان مین بھی، ان کو شامل ہونا پڑا، اس طرح قحطانی، مضری، زبیری، مروانی، شیعی اور خوارج کی مختلف پارٹیان قائم ہو گئین، اور کوفہ و بصرہ اس نئی زندگی کے سب سے بڑے مرکز بن گئے،

۲- دوسری روش ان مہاجرین و انصار کی تھی، جو صرف جزیرۂ عرب مین رہتے تھے،

ان مین حجاز کے اکثر باشندے صحابہؓ، خلفاء اور بنو ہاشم کے خاندان سے تھے، جو حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کو دل سے تو ناپسند کرتے تھے، لیکن اسلامی مصالح کی بناء پر علانیہ اس کا اظہار نہین کرتے تھے، اور چونکہ دولت کا خاندانی سرمایہ ان کے لئے کافی تھا، اس لئے عسکری ملازمت سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے، ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جن کو حضرت امیر معاویہؓ وظائف اور عطیے دیکر خوش رکھنا چاہتے تھے، اس لئے دو متضاد گروہ پیدا ہو گئے، جن کے اطوار زندگی باہم مختلف تھے، زیادہ تر لوگ تو عبادت اور قرآن و حدیث، فقہ، اور سیر و مغازی کے درس و تدریس مین مصروف رہتے تھے، لیکن بعض دولت مند نوجوانون نے عیش پرستی کی زندگی اختیار کر لی، اور عجمی غلامون اور گانے بجانے والی لونڈیون نے گا بجا کر، اور رند مزاج شعراء نے عاشقانہ غزلین سُنا سُنا کر ان کو اور متوالا کر دیا، لیکن صحرا نشین بدوؤن کی زندگی، اس حیثیت سے تو زمانہ جاہلیت کی زندگی سے مشابہ تھی، کہ یہ لوگ بھی جنگلون اور چراگاہون مین گھوم پھر کر اونٹ اور بکریان چراتے تھے، اور باہم مفاخرت اور ہجوگوئی کرتے تھے، البتہ چونکہ ایمان لا چکے تھے، اس لئے لوٹ مار نہین کرتے تھے،

ان مین بعض قبائل کی عورتین حسین وجمیل ہوتی تھین، اور جب ان کے مرد جنگ یا تجارت وغیرہ کے لئے نکل جاتے تھے، اور گھر مین صرف عورتین بوڑھے اور بچے رہ جاتے تو اس قبیلہ یا اس کے پڑوس مین رہنے والے قبیلہ کے نوجوانون کے لئے میدان صاف ہوجاتا تھا، اور چونکہ بدوون مین پردے کا رواج بہت کم تھا، اس لئے ان نوجوانون کو نوجوان لڑکیون سے ملنے جلنے اور گفتگو کرنے کا پورا موقع ملتا تھا، اس سے ان مین باہم پاک محبت پیدا ہوجاتی تھی، اور اس پاک محبت مین زیادہ تر قبیلۂ بنو عذرہ اور نجد وحجاز کے لوگ مبتلا ہوتے تھے،

پھر جب ان قبائل کے لوگ سفر سے واپس آتے تھے، اور ان کو اپنی لڑکیون کے عشق ومحبت کا حال معلوم ہوتا تھا، تو وہ ان کو پردے مین بٹھا دیتے تھے، اور اُن کے عشاق کی گھات مین لگے رہتے، اگر عاشق کا قبیلہ طاقتور ہوتا، تو اپنے یہان کے سرکاری عامل سے فریادی ہوتا، جو عاشق سے توبہ کراتا تھا یا اس کو قید کردیتا تھا،

ان اسباب کا قدرتی نتیجہ اس زمانہ کے ادب پر بھی پڑا، یعنی جو لوگ شہری تھے، اُن کا ادب اُن کی مخصوص زندگی کے قالب مین ڈھل گیا، اور ہر سیاسی اور مذہبی گروہ مین ایسے خطباء اور شعراء پیدا ہوگئے جو تقریر اور شاعری کے ذریعہ سے اپنے سیاسی اور مذہبی مسلک کی تائید کرتے تھے، اور بصرہ کا مربد اور کوفہ کی مسجدین گویا ان شعراء وخطباء کا بازار عکاظ تھین،

اسی طرح حجاز مین وہان کے دولت مند نوجوانون کا اثر بھی شاعری پر پڑا، اور حجاز مین لطافت آمیز اور لوچدار غزل کو ترقی ہوئی جس نے رفتہ رفتہ زنانہ اور ظریفانہ شکل اختیار کرلی، بدوون کی خشک اور باوقار زندگی نے فخر ومباہات، ہجو وبدگوئی اور مدح ومرثیہ کے مضامین باندھے، اور عاشق مزاج شعراء نے پاکیزہ غزلین کہین جس کو قدیم اہلِ ادب پاکیزہ تغزل کا بہترین نمونہ سمجھتے ہین، ان اجمالی خصوصیات کے بعد ہم دورِ بنوامیہ کی شاعری کے انواع، مضامین اور اسلوب پر تفصیلی گفتگو کرتے ہین،

ہم اوپر بیان کرچکے ہین کہ مخضرمین یعنی ان شعراء کا کلام جنھون نے اسلام اور جاہلیت دونون کا زمانہ پایا ہے، دوگونہ خصوصیت رکھتا ہے، ایک طرف تو انھون نے زمانۂ جاہلیت مین جو کچھ کہا ہے، وہ دورِ جاہلیت کی زندگی کو نمایان کرتا ہے، اور دوسری طرف زمانۂ اسلام مین جو کچھ کہا ہے، اس مین اسلام کی ابتدائی زندگی کے آثار پائے جاتے ہین،

لیکن دورِ بنوامیہ کی شاعری اس اسلامی زندگی کا مرقع پیش کرتی ہے، جو زمانہ جاہلیت کے بُت پرستانہ اثرات سے الگ ہوکر اسلامی اقتدار کے سامنے سربسجود ہوگئی تھی، اس کے ساتھ بہت سے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی انقلابات نے اس کو عہدِ نبوت اور عہد خلفاے راشدین کی شاعری سے ممتاز کردیا تھا، اس لئے اگرچہ اسلوب اور طرز بیان کے لحاظ سے وہ مخضرمین کی شاعری سے مختلف ہوگئی تھی، لیکن وزن، قافیہ اور دوسری حیثیتون سے اس کا قالب وہی رہا۔ جو دورِ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور مین تھا، البتہ بنوامیہ کے دور مین رجز کی طرف خاص توجہ کی گئی، اور اس مین تقریباً قصائد کی تمام خصوصیتین پیدا ہوگئین، بادیہ نشین شعراء ہرن، شترمرغ کے بچے، اور نیل گاؤ وغیرہ کی شان مین رجز کے چند شعر کہتے تھے، لیکن اس دور مین چند رجزگو شعراء نے قصائد کی طرح طویل رجز لکھے، اور اس مین مدح، فخر، ہجو اور مرثیہ کے مضامین شامل کردیئے، اور شعراے جاہلیت کی طرح اس کی ابتدا تشبیب سے کی، اور ان رجزگو شعراء مین ابوالنجم عجلی عجاج تمیمی اور اس کے فرزند روبہ نے زیادہ شہرت حاصل کی،

اس دور کی شاعری مین نئے نئے برگ وبار پیدا ہوگئے، اور وہ خاص طور پر شعراء کا ذریعۂ معاش بن گئی، لمبے لمبے قصیدے اور رجز کہے جانے لگے، وزن اور قافیہ کے عیوب کم ہوگئے، معانی مین نزاکت پیدا ہوگئی، تشبیب اور غزل کے الفاظ اور اسلوب بیان مین لوچ پیدا ہوگیا، اور ان کا بہت ساحصہ بزم طرب مین گانے بجانے کے قابل ہوگیا، اس لئے اموی خلفاء، امراء اور سیاسی پارٹیون کے لیڈرون

کی نگاہ مین شاعری کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی، اور انھون نے شاعری کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا، اور اس کی وہی حیثیت ہوگئی، جو اس زمانہ مین مختلف پارٹیون کے اخبارات کی ہے؛ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا جن لوگون کی حمایت کرتے تھے، اُن کی نگاہ مین اُن کی وقعت بہت زیادہ بڑھ گئی، اور جن لوگون کی مخالفت کرتے تھے، وہ ان کے دشمن ہوگئے،

غرض جو مختلف سیاسی پارٹیان قائم ہوگئی تھین، اُن سب کے الگ الگ شعراء تھے جن مین باہم معرکہ آرائی رہتی تھی، اور اس معرکہ آرائی مین لغت اور ادب کے علماء بھی اس طرح شریک ہو جاتے تھے، کہ ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر ترجیح دیتے تھے، اور اُن کے کلام پر تنقید کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء نے ان نقادانِ فن کی تنقید کے خوف سے اپنے کلام کو ہر ممکن طریقہ سے بہتر بنانے کی کوشش کی، اس لئے مخضرمین اور اس دور کے آغاز مین قافیے کے جو عیوب عام طور پر شعراء کے کلام مین پائے جاتے تھے، وہ دور ہوگئے، اور خلفاء کی مدح اور ان کے مستحق خلافت ثابت کرنے کی وجہ سے شاعری سیکڑون شعراء کا ذریعہ معاش بن گئی،

اس طرح عربی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا اور مضامین اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اس مین جو خصوصیتین پیدا ہوئین، وہ حسب ذیل ہین،

۱- مداحی :- زمانہ جاہلیت سے مداحی شاعری کا خاص موضوع تھی، لیکن ابتداءً ذریعہ معاش نہ تھی، البتہ اموی دور کے اخیر مین مالی منفعت کا ذریعہ بن گئی، اسلام کے دور مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوتِ اسلام کی تائید کے لئے مدحیہ قصائد کی اجازت دی لیکن یہ مدح صرف امور رسالت تک محدود تھی، اس کے علاوہ محض ایک شخص کی جا و بیجا مدح کرنے کی آپ نے ممانعت کی تھی، خلفائے راشدین کا طرزِ عمل بھی یہی رہا- اس لئے ایک مدت تک شاعری ذریعہ معاش نہ بن سکی، بنوامیہ کا دور شروع ہوا، تو حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی دعوت کی تائید کے لئے کسی قدر

مداحانہ قصائد کو پسند کیا، اس کے بعد بنو مروان نے ہر قسم کی جائز و ناجائز مداحی کی حوصلہ افزائی کی، اور اس پر شعراء کو گران قدر صلے دیئے، اُن کے عمال اور سیاسی پارٹیون کے لیڈرون نے بھی یہی روش اختیار کی، اور شعراء نے اس سلسلہ مین ایسے ایسے عجیب و غریب مضامین پیدا کئے جن کو اُن کے بعد کے شعراء نے نہایت مبالغہ آمیز بنادیا،

۲- ھجو :- ابتداءے اسلام مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو صرف مشرکین کی ہجو کی اجازت دی تھی، ان کے علاوہ کسی اور کی ہجو کی اجازت نہ تھی، بلکہ حضرت عمرؓ نے حطیئہ کو ہجو گوئی کے جرم مین قید کر دیا تھا، لیکن سیاسی معاملات مین جو مسلمان بنوامیہ کے مخالف تھے ان کی ہجو سے بنوامیہ نے چشم پوشی کی، اس لئے ہجو گوئی کا ایک طویل سلسلہ جاری ہوگیا، اور زمانہ جاہلیت سے بھی زیادہ اُس نے ترقی کی، اگر بنوامیہ نے اس پر سزائین دی ہوتین، تو عربی شاعری ایک مدت تک فحاشی اور بدزبانی سے محفوظ رہتی،

۳- فخر :- اسلام نے خداوند تعالیٰ کے احسانات، مشرکین پر غلبہ اور اسلامی فضائل کے ساتھ متصف ہونے پر فخر کرنے کو جائز رکھا تھا، لیکن بنوامیہ کے زمانہ مین شعراء نے زمانہ جاہلیت کے جنگی واقعات اور فتوحات پر فخر کرنا شروع کیا، اس سے زمانہ جاہلیت کی عصبیت جس کی اسلام نے ممانعت کی تھی، دوبارہ زندہ ہوگئی، اسی سلسلے مین انھون نے مسرفین کی فیاضیون پر بھی فخر و مباہات کیا، اگرچہ اس قسم کی فخاریان اسلام مین ناجائز تھین، تاہم اُن کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ دور جاہلیت کے تاریخی واقعات محفوظ رہ گئے،

۴- سیاسی شاعری :- اس قسم کی شاعری اگرچہ زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام بالخصوص حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ کے زمانہ ہی سے شروع ہوگئی تھی لیکن بنوامیہ کے زمانہ مین اس کا دائرہ اور وسیع ہوگیا، اور وہ صرف بنوہاشم اور بنوامیہ کی تائید و حمایت تک محدود نہین رہی، بلکہ دوسری سیاسی پارٹیون

کی تائید وحمایت بھی اس مین شامل ہو گئی، بنوامیہ کی حمایت جن شعراء نے کی، اُن مین اخطل، جریر، فرزدق اور نصیب زیادہ مشہور ہین، زبیریہ پارٹی کے حامیون مین عبداللہ بن قیس الرقیات، خوارج کے حامیون مین عمران بن حطان اور طرماح بن حکیم اور شیعون کے حامیون مین کمیت اسدی زیادہ شہرت رکھتے ہین،

۵- غزل، اس کی دو قسمین رائج ہوئین، ایک تو عریان غزلگوئی، جس کا رواج حجاز کے شہری دولت مندون مین جو مہاجرین، انصار اور مجاہدین کی اولاد سے تھے، ہوا، ان مین بہت سے شعراء، مغنی اور مسخرے پیدا ہو گئے، اور غزل کے سوا اس طبقہ کو دوسرے اصناف شعر سے کوئی دلچسپی باقی نہین رہی اس قسم کے غزل گو شعراء مین احوص اور عمر بن ابی ربیعہ نے زیادہ شہرت حاصل کی، لیکن ان دونون مین عمر بن ابی ربیعہ کی غزلون مین زیادہ عریانی پائی جاتی ہے، وہ اپنی غزلون مین علانیہ عورتون کا نام لیتا ہے، اور ان کے ساتھ جو عاشقانہ واقعات بیان کرتا ہے، وہ زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہین، اس نے ایک بہت بڑا دیوان مرتب کیا، جس مین تمامتر اسی قسم کی غزلین پائی جاتی ہین، دوسری قسم کی متین سنجیدہ، اور حقیقی عشق و محبت کے جذبات سے لبریز غزل گوئی حجاز کے صحرانشین نوجوان بدوون مین پیدا ہوئی، جو قبیلہ بنو عذرہ اور قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے، اس قسم کے غزل گو شعراء مین جمیل بن معمر نے جو بثینہ کا عاشق صادق تھا، اور کثیر نے جو عزہ پر فریفتہ تھا، زیادہ شہرت حاصل کی، اس قسم کی غزلگوئی مین بڑے بڑے قصائد بلکہ دیوان کے دیوان لکھے گئے، جس کی نظیر زمانہ جاہلیت اور آغاز اسلام مین نہین پائی جاتی، اور وہ صرف مسلمان بدوؤن کے دماغ کی پیداوار ہے،

اسلوب بیان کے لحاظ سے اس دور کی شاعری کا وہی انداز قائم رہا۔ جو زمانہ جاہلیت اور آغاز اسلام مین تھا، شعراء قصائد کی ابتداء تشبیب سے کرتے تھے، جس مین معشوقون کے کھنڈرات سفر وغیرہ کا ذکر ہوتا تھا، پھر اپنی اور اپنی قوم کی مدح مین چند شعر کہتے تھے، اس کے بعد قصیدہ کے

اصل موضوع یعنی مدح یا ہجو پر آتے تھے، اگرچہ تشبیب مرثیہ کے لئے موزون نہ تھی تاہم مرثیون کی ابتداء بھی تشبیب ہی سے کرتے تھے، کیونکہ یہ ایک تقلیدی اور رسمی چیز تھی، اس کو درحقیقت عشق و محبت سے کوئی تعلق نہ تھا،

جہان تک الفاظ کا تعلق تھا، مدح، فخر اور سیر و شکار وغیرہ کے بیان مین شاندار، پُرشکوہ اور نامانوس الفاظ لاتے تھے، بلکہ فرزدق ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نامانوس الفاظ لاتا تھا تاکہ اہل نحو اور اہل لغت اس کے کلام کے ساتھ زیادہ اعتناء کرین، البتہ دونون قسم کی غزلون مین نرم، شیرین اور سادہ الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، مختصر یہ کہ صحت اور فصاحت دونون حیثیتون سے اس دور مین عربی شاعری منتہائے کمال تک پہنچ گئی، یہان تک کہ بعض قدیم اہل ادب نے اس کو جاہلیت اور مخضرمین دونون کی شاعری پر ترجیح دی ہے،

نثر خطابت بنوامیہ کے دورِ حکومت مین خطابت کے محرکات عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ سے بہت زیادہ بڑھ گئے، کیونکہ خانہ جنگیون اور بغاوتون کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا، بہت سی مذہبی اور سیاسی پارٹیان قائم ہو گئی تھین، فتوحات اسلامیہ کا دائرہ خراسان، ترکستان اور سندھ تک پہنچ گیا تھا اور چونکہ حاکم و محکوم دونون کی زبان ایک تھی، اور بہت سے مواقع ایسے پیدا ہو گئے تھے، جہان تقریر سے کام چل سکتا تھا، اور چونکہ اہل عرب پر فصاحت و بلاغت کا بہت زیادہ اثر پڑتا تھا، اس لئے اس دور مین تقریر و خطابت کو بہت زیادہ ترقی ہوئی،

تمام خلفاء بنوامیہ کا دستور تھا کہ اپنے بچون کو صحرانشین بدوؤن مین بھیج دیتے تھے، کہ وہ فصاحت اور شہسواری مین کمال پیدا کرین، اور موٹی جھوٹی زندگی بسر کرنے کے عادی ہون صرف ولید بن عبدالملک تربیت کے اس طریقہ سے محروم رہا، اس لئے اس کی گفتگو مین زبان کی بعض غلطیان پائی جاتی ہین، اس زمانہ مین گورنری اور سپہ سالاری کے عہدے قریش ہی تک

محدود نہین رہے، بلکہ تمام اہلِ عرب کو ملنے لگے تھے، اس لئے ان سب مین بڑے بڑے زبان آور
خطیب پیدا ہونے لگے،

مذہبی، سیاسی اور اجتماعی حیثیت سے نئی نئی باتین پیدا ہوئین، اس لئے خطابت کے بھی
نئے نئے موضوع پیدا ہوگئے، مثلاً

(۱) شیعون اور خارجیون کے فرقے دوسرون کو اپنے اپنے مذہب کی دعوت تقریر
کے ذریعہ سے دینے لگے،

(۲) خطابت سیاسی پروپیگنڈا کا ایک بڑا ذریعہ بن گئی،

(۳) مختلف قبیلون اور اہلِ عرب اور فرقہ شعوبیہ مین جو باہمی تعصب پیدا ہو گیا تھا،
اس کا اظہار فخر اور ہجو کی صورت مین تقریر کے ذریعہ سے ہونے لگا،

(۴) خلفاے بنو امیہ نے اس کو دھمکی کا ایک بڑا ذریعہ بنا لیا،

ان تمام صورتون کے علاوہ زمانۂ جاہلیت اور آغاز اسلام مین تقریر و خطابت کے ذریعہ سے
جو کام لئے جاتے تھے، مثلاً جنگ کے ذریعہ لوگون کو ابھارنا، کسی نیک کام کی نصیحت کرنا، کسی
شرعی حکم کی وضاحت کرنا، جمعہ، عیدین اور زمانۂ حج مین خطبہ دینا، ان مین بدستور خطابت سے
کام لیا جانے لگا،

خطبات کی ابتدا ہمیشہ حمد و نعت سے کی جاتی تھی، چنانچہ زیاد بن ابیہ جب بصرہ مین گورنر
ہو کر آیا، اور باغیون کے ڈرانے کے لئے اپنی تقریر مین اس اسلوب کی خلاف ورزی کی تو اس پر
لوگون نے اعتراض کیا، اور اس کے خطبہ کو بتراء کا لقب دیا، یعنی بے سر کا خطبۂ حمد و نعت کے بعد خطیب اپنے مقاصد
بیان کرتا تھا، اخیر مین خطبہ ان الفاظ پر ختم کرتا تھا، اقول قولی ہذا و استغفر اللہ لی و لکم، بعض اوقات اس کے
بعد بھی جمعہ اور موسمِ حج مین حمد و نعت کا اضافہ کرتا تھا، اور خلیفہ کو بھی دعا دیتا تھا، خلفاے بنو امیہ

اور اُن کے گورنر کسی شورش کے فرو ہو جانے کے بعد اہل شہر کے سامنے جو خطبے دیتے تھے، ان مین
دھمکی اور سب و شتم کے الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کرتے تھے، اور ایسے اشعار پڑھتے تھے
جن سے اُن کے دلون مین رعب و داب کا اثر پڑے، اور قرآن مجید کی وہ آیتین پڑھتے تھے جن مین
باغیون کے انجام بد کا تذکرہ ہوتا، جب بدوون یا فصحا کے سامنے خطبے دیتے تھے تو بہت سے نامانوس
الفاظ استعمال کرتے تھے، تاکہ اُن کی نگاہون مین اُن کی وقعت بڑھ جائے، اور ان کے خطبات
شاندار بن جائین،

خطبہ دیتے وقت بالکل اہلِ عرب کی وضع اختیار کرتے تھے، یعنی کھڑے ہو کر کمان یا
تلوار کے قبضہ یا عصا پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے، اسی بنا پر جب ایک بار ولید بن عبد الملک نے بیٹھکر
خطبہ دیا تو اس کو ناپسندیدہ خیال کیا گیا،

مختصر یہ کہ اس دور مین خطابت منتہاے کمال کو پہنچ گئی، کیونکہ عربیت کو اس زمانے کے بڑے
بڑے فصحا نے اپنی اصلی حالت مین قائم رکھا تھا، اور یہ حالت خلافتِ عباسیہ کے زمانہ مین بھی
ایک صدی تک قائم رہی، اور اس دور مین بھی بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے،

فن انشاء

زمانۂ جاہلیت مین مضر کے اکثر قبیلے ان پڑھ اور بدو تھے، لیکن جب ان مین شہری
باشندون نے یمن، شام اور عراق کے باشندون سے تجارتی سلسلہ قائم کیا، تو مجبوراً ان کو انبار
کے باشندون سے لکھنا پڑھنا سیکھنا پڑا، اور سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ کے دادا حرب بن امیہ
نے اُن سے لکھنا پڑھنا سیکھا، اسلام آیا تو اہلِ مکہ کا ایک گروہ لکھنا پڑھنا سیکھ چکا تھا جس مین بعض
لوگون نے اسلام کو قبول کرکے ہجرت کی، اور انصار نے بھی ان سے اور اسیرانِ بدر سے لکھنا پڑھنا
سیکھ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی ترغیب دی، اور مہاجرین و انصار مین
بہت سے لکھنے پڑھنے والے پیدا ہوگئے، آپ امرا و سلاطین کے نام جو خط بھیجتے تھے، جو قبیلے اسلام

لاتے تھے، ان کے ساتھ معاہدے، جنگجو فرقون سے جو مصالحت کرتے تھے، ان سب کو یہی لوگ لکھتے تھے، اس لئے اب لکھنے کے معنی خطوط، معاہدے اور دفتری کاروبار کے لکھنے کے ہوگئے،

سب سے پہلے خلافت کے کاروبار کے متعلق حضرت عمرؓ کے زمانہ مین تحریری کام لیا گیا، کیونکہ فتوحات، مال غنیمت اور فوجی نظام نے اُن کے زمانہ مین بڑی وسعت حاصل کی، اسی لئے انھون نے ایک فوجی دفتر قائم کیا، جس مین سپاہیون کے نام ونسب اور ان کی تنخواہین لکھی جاتی تھین، اُن کے بعد اور خلفاؔ نے بھی اُن کی تقلید کی یہان تک کہ جب بنو اُمیّہ کا دور خلافت شروع ہوا، تو حضرت امیر معاویہؓ نے الگ الگ اور بھی متعدد دفتر مثلاً دفتر خراج، دفتر خاتم، دفتر خط وکتابت قائم کئے، اُن مین پہلے تو رومی فارسی اور قبطی زبان اور رسم خط کا رواج تھا، لیکن رفتہ رفتہ اُن کی جگہ عربی زبان اور عربی رسم خط نے لے لی، اور اب ہر قسم کے دفترون مین عربی زبان اور عربی رسم خط کا رواج ہوگیا،

پہلے تو تمام خطوط وفرامین وغیرہ روزمرہ کی بول چال مین لکھے جاتے تھے، اور اصل مقصد کو مختصر الفاظ مین بیان کیا جاتا تھا اور خلفاء، گورنر اور سپہ سالار چونکہ خود فصیح وبلیغ ہوتے تھے، اسلئے وہ خود بولتے جاتے تھے اور لکھنے والے ان کو لکھتے جاتے تھے، لیکن جب تمام عراق اور مصر کے عربون کی اولاد اور ایران، روم اور قبط کے عجمیون سے جو عرب ہوگئے تھے، یہ کام لیا جانے لگا، تو انھون نے اسکو ایک مستقل فن بنالیا اور اس مین عبارت آرائی کرنے لگے، اور اس کیلئے علم ادب، حفظ قرآن اور اشعار عرب کی تعلیم حاصل کی، اور اُن کے اقتباسات اور شاعرانہ تشبیہات اور ضرب الامثال وغیرہ سے کام لیا، اور ایرانی اور رومی اسلوب بیان کا ترجمہ عربی زبان مین کیا، اور ہشام کے زمانہ مین اس کے آزاد شدہ غلام ابوالعلاء سالم نے اس فن کی تکمیل کی جو عربی اور یونانی دونون زبانون سے اچھی طرح واقف تھا، اس کے داماد عبدالحمید بن یحییٰ نے اس سے اس کی تعلیم حاصل کی اور فن انشا کو ایک مستقل بنا دیا،

کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

اقبال کی شاعری کا موضوع بہت پامال ہوچکا ہے اور اس پر اتنا لکھا جاچکا ہے کہ اس کا کوئی پہلو مشکل سے تشنہ باقی ہوگا، اور اب اس پر لکھنے کی بہت کم گنجایش ہے، لیکن جن لوگون کی نظر انکے پورے کلام اور اس کی غرض وغایت پر نہین ہے، اُن کی جانب سے اُن پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ پرست شاعر تھے، ان کا دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت سے خالی تھا، انھون نے قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے، اُن کی تعلیمات اور اُن کے پیام مین عالمگیریت نہین ہے، انھون نے عالم انسانیت یا کم از کم ہندوستانی قوم کو مخاطب بنانے کے بجائے، صرف مسلمانون سے خطاب کیا ہے، اور اپنی شاعری مین صرف اسلام کی تبلیغ واشاعت کی ہے، وہ اسلامی حکومت کے قیام کے داعی اور صرف مسلمانون کا غلبہ واقتدار چاہتے تھے، ان کی فرقہ پرستی کے ثبوت مین اور بھی اسی قبیل کے اعتراضات کئے جاتے ہین،

لیکن یہ تمام اعتراضات اقبال کے افکار وتصورات، اُن کے نصب العین، اُن کے مقصد شاعری، یورپ کی سیاست، مذہب اسلام، مشرقی قومون خصوصاً مسلمانون کے زوال کی تاریخ سے ناواقفیت اور کلام اقبال پر قصور نظر کا نتیجہ ہین، اگر ان امور کی روشنی مین اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سارے اعتراضات خودبخود دفع ہوجائین گے،

اقبال کے دل مین قوم ووطن کی محبت بھی تھی، لیکن اُن کی قومیت ووطنیت کا تصور محدود

نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت کے بجائے عالمگیر انسانی اخوت تھا، اور وہ نسل و وطن کے محدود دائرہ کو توڑ کر تمام انسانون کو اخوت کے رشتہ مین منسلک کرنا چاہتے تھے، اور اس کے لئے نسلی اور وطنی قومیت اور وطنیت کے موجودہ تصور کی اصلاح ضروری تھی، گو انھون نے جا بجا مسلمانون کو مخاطب کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کا پیام عالمگیر تھا، ان دونون مین کوئی تضاد نہین ہے، انھون نے جارحانہ جنگ مقابلہ کی کہین تعلیم نہین دی ہے، وہ موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے اسلام اور مسلمانون کا سیاسی غلبہ و اقتدار نہین چاہتے تھے، وہ ان معنون مین اسلامی حکومت کے داعی تھے، بلکہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت سے ان کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت تھی، آیندہ سطور مین ان مسائل پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے گی،

اقبال اور حب قوم و وطن

قوم و وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جس سے انسان کیا حیوان بھی خالی نہین ہین، اس لئے اسلام نے بھی اس کی تعلیم دی ہے جس پر عرب کے فضائل کی حدیثین اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل شاہد ہے، بعض ضعیف روایتون مین تو وطن کی محبت کو ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربون کی ہدایت و اصلاح کے لئے جو کوششین فرمائین، اور اس راہ مین جو جو سختیان جھیلین، اس سے ہر تاریخ دان واقف ہے، اس سے بڑھ کر آپ کے حب قوم و وطن کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عربون کے انتہائی جور و ستم پر بھی اُن کے لئے آپ کی زبان سے یہی دعا نکلتی تھی، کہ خدایا میری قوم کو راہ راست دکھا کہ وہ اپنا اچھا برا نہین سمجھتے، قوم و وطن سے رسول اکرم اور صحابہ کرام کی محبت کے بہت سے واقعات حدیثون مین موجود ہین، یہ ایک ایسا مسلّم مسئلہ ہے جس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہین، اس لئے اگر اقبال کو اسلامی شاعر مان لیا جائے، تو ان کا کلام اور بھی قوم و وطن کی محبت سے خالی نہین ہو سکتا، ورنہ پھر انھین اسلامی شاعر کہنا صحیح نہ ہوگا،

ابتدائی دور مین تو ان پر قومیت اور وطنیت کا اتنا غلبہ تھا کہ انھون نے "نیا شوالہ" اور

"ترانہ ہندی" جیسی حب قوم و وطن مین ڈوبی ہوئی نظمین کہین لیکن پھر موجودہ زمانہ کی نیشنلزم کے نتائج بد دیکھنے کے بعد جس کی تفصیل آیندہ آئے گی، اُن کے خیالات بدل گئے، اور انھون نے نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت کے بجائے افکار و تصورات کی وحدت اور انسانی اخوت کی بنیاد پر عالمگیر قومیت و وطنیت کی دعوت شروع کی،

لیکن اس کا یہ مقصد نہین تھا کہ ان کی نگاہ مین نسلی اور جغرافی قوم و وطن کی کوئی حیثیت نہین رہ گئی، اور ان کا دل اس کی محبت سے خالی ہو گیا، اور انھون نے اس کے حقوق نظر انداز کر دیئے، بلکہ انھون نے اس کے حدود مقرر کر دیئے، اور اس حد کے اندر ان کے دل مین اپنے ملک و قوم کی پوری عظمت و محبت تھی، اور وہ ہندوستان کی غلامی پر ویسا ہی دردمند اور اس کی آزادی کے لئے تڑپتا تھا جس قدر ایک بڑے سے بڑے قوم پرور کا دل تڑپ سکتا ہے، اور یہ محبت و عظمت ہر دور مین یکسان قائم رہی، نسلی اور جغرافی وطنیت کے بارہ مین اُن کے خیالات ۱۹۰۸ء کے بعد بدل چکے تھے، جیسا کہ انکی مشہور نظم وطن سے ظاہر ہوتا ہے،

اس دور مین مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤن مین بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ہندوستان کی عظمت و محبت

لیکن اس کے بعد بھی قوم و وطن کی محبت انکے دل مین پوری طرح موجود تھی، جس کا ثبوت ان کے آخری دور کا کلام ہے، اس دور کا کلام بھی حب قوم و وطن سے خالی نہین ہے، چنانچہ جاوید نامہ مین جو ان کی نہایت اہم تصنیف ہے اور ان کی وفات سے صرف چند سال پہلے لکھی گئی ہے ہندوستان کے متعلق بکثرت نظمین ہین جن کے لفظ لفظ سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے، ذیل کی نظم مین ہندوستان کی عظمت و محبت

کا کس موثر الفاظ مین اظہار کرتے ہین،

باز گو از ہند و از ہندوستان　　آنکہ با کاہش نیرزد آسمان

آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد　　آنکہ اندر دیر او آتش فسرد

آنکہ دل از بہرِ او خون کردہ ایم　　آنکہ یادش را بجان پروردہ ایم

از غمِ ما کن غمِ او را قیاس

آہ از معشوق عاشق ناشناس

ان اشعار مین پہلے اور دوسرے شعر خاص طور سے قابلِ توجہ ہین، جن مین ہندو مسلمانون دونون کی زبون حالی کا ماتم ہے،

ہندوستان کی غلامی کا ماتم

ایک دوسری نظم مین ہندوستان کی عظمت کے ذکر کے ساتھ کس درد سے اس کی غلامی پر آنسو بہائے ہین،

می ندانی خطۂ ہندوستان　　آن عزیزِ خاطرِ صاحب دلان

خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز　　درمیانِ خاک و خون غلطد ہنوز

در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت　　این ہمہ کردارِ آن ارواحِ زشت

اسی نظم مین یہ مشہور شعر ہے،

جعفر از بنگال و صادق از دکن　　ننگِ آدم ننگِ دین ننگِ وطن

جاوید نامہ مین عالمِ بالا مین جو تمثیلی مناظر دکھائے گئے ہین، ان مین ہندوستان کی روح یا مادرِ وطن کی تصویر ان الفاظ مین کھینچی ہے،

آسمان شق گشت و حورِ پاک زاد　　پردہ را از چہرۂ خود بر کشاد

در جبینش نارو نورے لایزال　　در دو چشم او سرورِ لایزال

حلۂ در بر سبک تر از سحاب　　تار و پودش از رگِ برگِ گلاب

با چنین خوبی نصیبش طوق و بند　　بر لبِ او نالہاے دردمند

کیا مادرِ ہند کی اس سے زیادہ پاکیزہ اور محزون تصویر کھینچنا ممکن ہے، اس کے بعد مادرِ ہند کی زبان سے ہندوستان کی غلامی اور غدارانِ وطن کی غداری کا ماتم ہے، یہ نظم طویل ہے، اس لئے صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہین، مادرِ ہند نالہ کرتی ہے،

مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش　　زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش

بر زمانِ رفتہ می بندد نظر　　ز آتشِ افسردہ می سوزد جگر

بندہا بر دست و پاے من ازوست　　نالہاے نارساے من ازوست

خویشتن را از خودی پرداختہ　　از رسومِ کہنہ زندان ساختہ

کے شبِ ہندوستان آید بروز　　مرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز

تا ز قیدِ یک بدن وا می رہد　　آشیان اندر تنِ دیگر نہد

دینِ او آئینِ او سوداگریست　　عنتری اندر لباسِ حیدریست

تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر　　رسمِ او آئینِ او گردد دگر

از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم　　ملتِ او از وجودِ او لئیم

ملتے را ہر کجا غارتگریست　　اصلِ او از صادقے یا جعفریست

الامان از روحِ جعفر الامان

الامان از جعفرانِ این زمان

ہندوستان کی غلامی کے ماتم مین اُن کی بہت سی نظمین ہین ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے، اس لئے صرف چند مثالون پر اکتفا کیا گیا،

ہندو مسلم اختلاف کا غم

اقبال پر فرقہ پروری کا الزام لگایا جاتا ہے، حالانکہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے متمنی تھے، اور ان کے اختلاف پر ان کا دل غمگین تھا، ایک مستقل نظم مین ہندو مسلمانون کے اختلاف پر آنسو بہائے ہین، اور اس کو ہندوستان کی غلامی کا سبب قرار دیا ہے، چند اشعار یہ ہین،

ای ہمالہ اے اٹک اے رود گنگ | زیستن تا کے چنان بے آب و رنگ
پیر مردان از فراست بے نصیب | نوجوانان از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر | خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگران | جاودان مرگ است نے خواب گران
نیست این مرگے کہ آید از آسمان | تخم او بالد ز اعماق جان
تا فرنگی قومے از مغرب زمین | ثالث آمد در نزاع کفر و دین
کس نداند جلوۂ آب از سراب | انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

کشمیر اور دوسری خطون کی مدح

ہندوستان اور اس کے مختلف خطون کے فضائل اور تعریف مین بہت سی نظمین ہین، ایک نظم مین یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندوستانیون کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریون نے دی،

ہند را این ذوق آزادی کہ داد | صید را سودائے صیادی کہ داد
این برہمن زادگان زندہ دل | لالۂ احمر ز روئے شان خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش | از نگاہ شان فرنگ اندر خروش
اصل شان از خاک دامنگیر ماست | مطلع این اختران کشمیر ماست

گو اقبال خود نو مسلم کشمیری برہمن[1] تھے، لیکن موتی لال اور جواہر لال بھی کشمیری برہمن ہین، ان کے ہوتے ہوئے اس دعوی کی صداقت مین کیا شبہہ کیا جاسکتا ہے،

---

[1] نو مسلم کو مراد یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد کسی زمانہ مین مسلمان ہوئے، ان کو اپنی برہمنیت کا خود اعتراف ہے،
مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی | برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ہندوستان کے مسلمان شعراء کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ جیحون و فرات کی روانی پر رہتی ہے، لیکن اقبال کی نگاہ مین دریائے کاویری جیحون و فرات سے زیادہ عزیز تھا، سلطان ٹیپو کی زبان سے کہتے ہین،

رود کاویری یکے نرمک خرام | خستۂ شاید کہ از سیر دوام
در کہستان عمرہا نالیدۂ | راہ خود را بر مژہ کاویدۂ
اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات | اے دکن را آب تو آب حیات

ہندوستان کے صلحاء و اخیار سے عقیدت

اقبال کے دل مین ہندوستان کے صلحاء و اخیار کی بھی پوری عظمت و عقیدت تھی، جس پر رامچندر جی گوتم بدھ اور گرو نانک کی شان مین ان کی نظمین شاہد ہین، رامچندر جی کی عظمت ملاحظہ ہو،

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند | سب فلسفی ہین خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیون کی فکر فلک رس کا ہے اثر | رفعت مین آسمان سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس مین ہوئے ہین ہزارون ملک سرشت | مشہور جن کے دم سے ہے دنیا مین نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز | اہل نظر سمجھتے ہین اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی | روشن تر از سحر ہے زمانہ مین شام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت مین فرد تھا
پاکیزگی مین جوش شجاعت مین فرد تھا

جاوید نامہ مین دوسرے پیغمبرون اور صلحاء و اخیار کی تعلیمات کے ساتھ گوتم بدھ کی تعلیمات کو بھی ان کی زبان سے پیش کیا گیا ہے، وہ ایک زن رقاصہ کو نصیحت کرتے ہین،

مے دیرینہ و معشوق جوان چیزے نیست | پیش صاحب نظران حور جنان چیزے نیست

ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی بگذرد
کوہ و صحرا و بر و بحر کران چیزے نیست

دانشِ مغربیان فلسفۂ مشرقیان
ہمہ بت خانہ و در طوفِ بتان چیزے نیست

از خود اندیش و ازین بادیہ ترسان مگذر
کہ تو ہستی و وجود دو جہان چیزے نیست

در طریقیکہ بنوکِ مژہ کاویدم من
منزل و قافلہ و ریگِ روان چیزے نیست

بگذر از غیب کہ این وہم و گمان چیزے نیست
در جہان بودن و رستن ز جہان چیزے ہست

آن بہشتے کہ خدای بہ تو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جنان چیزے ہست

راحتِ جان طلبی؟ راحتِ جان چیزے نیست
در غمِ ہم نفسان اشکِ روان چیزے ہست

چشمِ مخمور و نگاہِ غلط انداز و سرود
ہمہ خوب است ولی خوشتر ازان چیزے ہست

حسنِ رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست
حسنِ کردار و خیالاتِ خوشان چیزے ہست

قدیم ہندوستان کے تاریک دور میں یہاں کی افسوسناک حالت کا نقشہ اور گوتم اور گرونانک کی اصلاحی کوششیں اور اُن کی روحانی تعلیمات ملاحظہ ہوں،

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یکدانہ کی

آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمین قابل نہ تھی

آہ شودر کے لئے ہندوستان غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل[1] نے جگایا خواب سے

سوامی رام تیرتھ کی عظمت،

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آزر بنا

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے

توڑ دیتا ہے بُتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

جاوید نامہ میں کائنات کے مختلف مسائل و حقائق کے متعلق مولانا روم سے ایک عارف ہندی (جوگی) کے سوالات اور مولانا کے جوابات کا ذکر ہے، یہ مکالمہ بہت طویل ہے، لیکن کم سے کم عارف ہندی کے جمال کا درشن کر لیجئے،

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد

موے بر سر بستہ و عریان بدن
گرد او مارے سفیدے حلقہ زن

آدمی از آب و گل بالاترے
عالم اندر خیالش پیکرے

وقت او را گردشِ ایام نے
کار او با چرخِ نیلی فام نے

---

[1] گرونانک

ان اسرار وحقائق کے متعلق عارف ہندی کے سوالات اور مولانا روم کے جوابات بڑے حکیمانہ ہیں، لیکن طوالت کے خیال سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے،

ہندوستان کے مشہور فلسفی شاعر برتری ہری کی زبان سے اس کا یہ فلسفۂ عمل بیان کیا گیا ہے،

ای خدایانِ تنک مایہ ز سنگ اند و ز خشت — برترے ہست کہ دور است ز دیر و ز کنشت
سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نرسد — زندگانی ہمہ کردار و چہ زیبا و چہ زشت
فاش گویم بہ تو حرفے کہ ندانند ہمہ کس — ای خوش آن بندہ کہ بر لوح دل او را بنوشت
این جہانے کہ تو بینی اثرِ یزدان نیست — چرخ از تست و ہم آن رشتہ کہ بر دوکِ تو رشت
پیش آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گذار — زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

یہ واضح رہے کہ یہ تمام نظمیں اس دور کی ہیں جب وطنیت اور قومیت کے متعلق اقبال کے خیالات بدل چکے تھے، اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا دل قوم و وطن کی محبت سے خالی تھا، لیکن کیا ان نظموں کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا؟

اقبال اور مشرق

اقبال کو نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا سے محبت تھی، اور اس کا دل اس کی زبون حالی پر بھی تڑپتا تھا، انھوں نے ایک مثنوی بھی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے نام سے لکھی ہے، جس میں مشرقی قوموں کو خطاب کیا ہے، ایک نظم میں کس جوش و خروش سے ایشیا کے شاندار ماضی، اس کے فضائل و مناقب اور کارناموں اور عالمِ انسانیت پر اس کے احسانات کا ذکر کیا ہے، اور اس کو دنیا کی ہدایت و رہنمائی کرنے کی دعوت دی ہے،

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست — ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم — شیوۂ آدم گری آموختیم
ہم ہنر ہم دین ز خاکِ خاورست — رشکِ گردون خاکِ پاکِ خاور است

وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب — آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
ہر صدف را گوہرِ نیسان ز ماست — شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست
روح خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم — خونِ آدم در رگِ خود دیدہ ایم
فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود — زد نخستین زخمہ بر تارِ وجود
داشتیم اندر میانِ سینہ داغ — بر سرِ راہے نہادیم این چراغ
اے امینِ دولتِ تہذیب و دین — آن یدِ بیضا برآر از آستین
خیز و از کارِ امم بکشا گرہ — نشۂ افرنگ را از سر بنہ

نقشے از جمعیتِ خاور فگن
واستان خود را ز دستِ اہرمن

ذیل کی نظم میں یورپ کی مادیت، لادینی، پرفریب سیاست اور انسانیت پر اس کی جور و ستم کا پردہ فاش کیا ہے، اور ایشیا کی بیداری اور آزادی کا مژدہ سنایا ہے،

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق — باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید — شب گذشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیرِ گردون رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برہ — ہر زمان اندر کمینِ برہ
مشکلاتِ حضرتِ انسان از وست — آدمیت را غمِ پنہان از وست
در نگاہش آدمی آب و گل است — کاروانِ زندگی بے منزل است

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں جس میں مشرق کو خطاب کیا گیا تھا

تو کوئی صدا نہ اٹھی، اور بالآخر ایک صدی کے بعد اسی فرزند مشرق نے اس کا جواب دیا،
اور بتایا،

ز جانِ بے قرارِ آتش کشادم   دلے در سینۂ مشرق نہادم
گلِ او شعلہ زار از نالۂ من   چو برق اندر وجودِ او فتادم

اُن کا دل جس طرح عالم اسلامی اور ہندوستان کی غلامی پر دردمند تھا، اسی طرح ابی سینیا کی غلامی پر رنجیدہ اور پُرغم تھا، چنانچہ اٹلی کو اس کے ظلم پر اس طرح ملامت کرتے ہین،

یورپ کے کرگسون کو نہین ہے ابھی خبر   ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال   غارت گری جہان مین ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروے کلیسا کا آئینہ   روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش

اُن کی ان نظمون مین بھی جو خالص ملی ہین، مشرق کی محبت کی چنگاریان نظر آتی ہین، چنانچہ سمرنا کی فتح اور ترکون کی نشاۃ ثانیہ کو وہ تنہا ایک اسلامی حکومت کی کامیابی نہین سمجھتے، بلکہ اس مین اُن کو مشرق کی بیداری کے آثار نظر آتے ہین،

عروقِ مردۂ مشرق مین خونِ زندگی دوڑا   سمجھ سکتے نہین اس راز کو سینا و فارابی
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی   زمین جولانگہِ اطلس قبایان تتاری ہے

وہ یورپ کی جمعیت اقوام کی طرح مشرقی قومون کی جمعیت بنانے کی تعلیم دیتے ہین، اور اس مین دنیا کی فلاح سمجھتے ہین،

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر   کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب   ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا   شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اُن کے دل مین نہ صرف اپنے ملک اور قوم بلکہ پورے ایشیا اور مشرق کی محبت تھی، اور وہ نہ صرف مسلمانون بلکہ ایشیائی قومون کی آزادی اور ترقی کے آرزومند تھے،

یورپ کی نیشنلزم کی مخالفت کے اسباب

البتہ وہ یورپ کی پیدا کردہ نیشنلزم کے جس کی بنیاد نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت بلکہ قوم و وطن پرستی پر ہے، ضرور خلاف تھے، اس لئے کہ یہ قومیت اور وطنیت عالم انسانیت کی دشمن ہے، اور اس سے انسانی وحدت کے بجائے ان مین تفریق اور گروہ بندی پیدا ہوئی ہے، خواہ اس کی ظاہری شکل کتنی ہی دلفریب ہو، لیکن اس کی بنیاد نسلی احساس برتری اور قومی خود غرضی پر ہے، جس کا لازمی نتیجہ کمزور قومون کے حقوق کی پامالی، اُن کی تباہی اور جنگ و خونریزی ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طاقتور اور ترقی یافتہ قوم اپنے مقابلہ مین دوسری کمزور قومون کو حقیر اور اس پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتی ہے، اس نسلی قومیت کے جو خونین تماشے صدیون سے دنیا مین ہو رہے ہین، اُن سے ہر شخص واقف ہے، گذشتہ ہولناک جنگ جس کی تباہیون سے اب تک دنیا کو نجات نہین ملی ہٹلر کے نسلی برتری ہی کے نعرہ کا نتیجہ تھی، اس نسلی برتری کے جذبہ قوم پرستی نے نہ صرف مختلف ملکون اور قومون بلکہ ایک ہی قوم مین اشرف و اعلیٰ اور پست و بلند طبقات قائم کر دیئے ہین، یورپ اپنے کو ایشیا سے افضل سمجھتا ہے، ایشیا والون کو اہل افریقہ کے مقابلہ مین برتری کا احساس ہے، ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم مین مختلف پست و بلند طبقون کی سب سے بڑی مثال ہندوستان ہے،

دوسرا نتیجہ بین الاقوامی اقتصادی کشمکش ہے، آج ہر طاقتور قوم اپنی اقتصادی اور تمدنی برتری قائم رکھنے کے لئے کمزور قومون کو غلام رکھنا چاہتی ہے، گذشتہ ساری لڑائیان اسی کا نتیجہ تھین،

اسی کے بدولت ایشیا صدیون تک یورپ کا غلام رہا، اور آج بھی جب کہ یورپ کی سیاسی گرفت ڈھیلی پڑگئی ہے اسکو یورپ کی اقتصادی غلامی سے نجات نہین ملی ہے، اور یہ کشمکش نہ صرف یورپ ایشیا اور افریقہ کے درمیان بلکہ خود ان براعظمون کے مختلف ملکون اور قومون کے درمیان بھی اسی طرح جاری ہے، گذشتہ جنگِ عظیم مین یورپ اور امریکہ کی حکومتین جس طرح آپس مین ٹکرائین، اور جاپان نے اپنے پڑوسی چین اور برما کیساتھ جو کچھ کیا، اور آج یورپین طاقتون مین جو کشمکش برپا ہے جس نے دنیا کے امن وامان کو خطرہ مین ڈال رکھا ہے، وہ سب کی نگاہ کے سامنے ہے، اقبال نے اسی دشمن انسانیت قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے،

اقوام جہان مین ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام مین مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وحدت واخوت کی عالمگیر دعوت

اس بنا پر انھون نے نسلی وجغرافی قومیت اور وطنیت کے بجائے عالمگیر انسانی وحدت اور اخوت ومحبت کی دعوت دی جس سے اُن کی کوئی کتاب بھی خالی نہین ہے،

مختلف نظمون کے مختلف اشعار ملاحظہ ہون،

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انسان کو — اخوت کا بیان ہوجا محبت کی زبان ہوجا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکران ہوجا

تمیز بندہ وآقا فساد آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستان سخت ہین فطرت کی تعزیرین

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیرین

نہ افغانیم ونے ترک وتتاریم — چمن زادیم وازیک شاخساریم

تمیز رنگ وبو برما حرام است — کہ ما پروردۂ یک شاخساریم

اس سے ظاہر ہوکہ ان کا پیام عالمگیر تھا، اور یہ اعتراض دور ہو گیا کہ اُن کے پیام مین عالمگیریت نہین ہے اور انھون نے صرف مسلمانون کو مخاطب بنایا ہے، اس مین شبہہ نہین کہ اُن کے کلام مین جابجا مسلمانون سے خصوصیت کے ساتھ خطاب ہو لیکن اس سے اُن کی تعلیم کی عالمگیریت مین فرق نہین آتا، اس لئے کہ بعض مخصوص نظمون کے علاوہ جو خاص مسلمانون کے لئے لکھی گئی ہین اور جن کی تعداد بہت کم ہے، اُن کی وہ نظمین بھی جن مین مسلمانون سے خطاب ہے، اپنے فائدہ کے لحاظ سے عام ہین، مثلاً اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصہ قومون کے عروج وزوال ترقی وتنزل اور موت و حیات کے فلسفہ پر مشتمل ہے، اس مین اگرچہ مسلمانون سے خطاب کیا گیا ہے لیکن وہ اصول سب قومون کے لئے یکسان ہین، انھون نے خود بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہو کہ "ع مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور" یعنی ان اصولون پر جو بھی عمل کرے گا، وہ کامیاب ہوگا، اس مین مسلم وکافر کی تخصیص نہین،

اس قسم کی عام تعلیمات سے ان کا کلام معمور ہے اور اس سے ان کے کلام پر نگاہ رکھنے والے پوری طرح واقف ہین، اس لئے اس کی مثالون کے نقل کرنے کی ضرورت نہین ہے تاہم اس سے انکار نہین کہ اُن کی بعض تعلیمات مسلمانون کے لئے مخصوص ہین، اس کے دو سبب ہین، ایک یہ کہ گذشتہ چند صدیون مین نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیاے اسلام کے مسلمانون پر عام زوال طاری ہوگیا تھا، اُن کی حکومتین مٹ گئی تھین، جو باقی تھین، وہ بھی بحال زبون یورپین طاقتون کے ہاتھون مین اسیر تھین، سیاسی زوال کے ساتھ اُن سے مذہبی روح بھی رخصت ہوگئی تھی، اور اُن کی حیثیت ایک پسماندہ قوم کی ہو کر رہ گئی تھی، اس لئے اقبال نے اُن کی مذہبی تجدید واصلاح اور سیاسی حیثیت سے ان کو ابھارنے کی بھی کوشش کی، جو نہ کوئی اخلاقی جرم ہے، اور نہ عالمگیر انسانی اخوت کے خلاف ہو گاندھی جی سب قومون کے دوست تھے، ان کا پیام اخوت عالمگیر تھا لیکن اس کے

باوجود وہ ہندو قوم اور ہندو مذہب کے سب سے بڑے محسن تھے، اور انھوں نے ان دونوں میں دوبارہ جان ڈالی، اس لئے اقبال کی مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی تجدید و اصلاح کی کوشش کیوں فرقہ پرستی پر محمول کیا جائے، جب کہ ان کے کلام میں عالمگیر انسانی اخوت کی دعوت بھی موجود ہے، دوسرا سبب آخر میں بیان کیا جائے گا،

کیا اقبال نے مسلمانوں کے حصول قوت اور جنگ و خونریزی کی تعلیم دی،

یہ اعتراض بھی کہ اقبال نے اس زمانہ میں جب کہ دنیا امن و سکون کو ترستی ہے، مسلمانوں کو حصولِ قوت اور جنگ و خونریزی کی تعلیم دی بالکل غلط یا کم از کم غلط فہمی پر مبنی ہے، ان کے بعض اشعار سے جو خاص مقصد کے ماتحت کہے گئے ہیں کلیۃً قاعدہ بنا لینا صحیح نہیں، اگر کچھ اشعار میں حصولِ قوت اور جنگ و مبارزت کی تعلیم ہے، تو سیکڑوں اشعار میں اخوت و محبت اور امن و صلح کی بھی دعوت ہے، اولاً حصول قوت اور جنگ و مبارزت دو الگ الگ چیزیں ہیں، حصولِ قوت کے معنی جنگ کے نہیں ہیں، انھوں نے مسلمانوں کو حصول قوت کی ضرور تعلیم دی ہے، لیکن اس کا سبب مسلمانوں کا زوال اور اُن کی تباہی ہے جس کے اور اسباب میں سے ایک بڑا سبب ان کا ضعف بھی ہے، اس لئے حصولِ قوت کی تعلیم جنگ و مبارزت کیلئے نہیں بلکہ بقائے حیات کے لئے ہے، اس کو جارحانہ قوت پر محمول کرنا صحیح نہیں، صدیوں کے زوال سے مسلمانوں کے قوائے عمل بالکل شل ہو گئے تھے، ان میں جان ڈالے بغیر مسلمان زندہ نہیں رہ سکتے تھے، یہ تو نہ صرف سیاسی بلکہ طبعی مسلمات میں سے ہے، کہ کوئی قوم، بلکہ دنیا کی کوئی ہستی قوت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی،

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے   ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

دوسرے ہر شر اور بدی کا مقابلہ ہمیشہ وعظ و پند اور نیکی و اخلاق سے نہیں کیا جا سکتا، اور کبھی کبھی علاج بالمثل ناگزیر ہو جاتا ہے، بدی کے بدلہ میں نیکی اور دشمنی کے بدلہ میں محبت کا اصول کتنا ہی روحانی اور دلفریب کیوں نہ ہو، ہر موقع پر کامیاب نہیں ہو سکتا، دنیا میں کتنے انسانوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم پر عمل کیا، آج بھی امن و صلح کی زبانی تجویزوں کا حشر سب کو معلوم ہے، درحقیقت

جب شر اور بدی اور ظلم و جور کی طاقتیں اخلاقی وعظ و پند سے نہ رکیں تو اُن کا مقابلہ قوت سے ضروری ہو جاتا ہے، ورنہ دنیا میں حق و انصاف اور امن و امان قائم نہیں رہ سکتا، شر کے مقابلہ کے لئے شر کی جو ظاہری شکل اختیار کی جاتی ہے وہ شر نہیں بلکہ درحقیقت خیر بن جاتی ہے، تندرست انسانی جسم میں سوئی چبھونا بھی جرم ہے، لیکن جب جسم کا کوئی حصہ ماؤف ہو جائے، تو پوری جسم کی حفاظت کے لئے ماؤف حصہ میں نشتر دینا بلکہ بعض اوقات اس کو کاٹ کر الگ کر دینا ضروری ہو جاتا ہے، اور یہ شر انسان کے لئے خیر بنجاتا ہے، یہی اصول اقوام کے خیر و شر کے لئے بھی ہے، اس لئے اگر بدی اور ظلم و جور کی طاقتیں آمادہ فساد ہوں تو انسانیت کی بھلائی کے لئے اس کا مقابلہ طاقت سے ضروری ہے، ہٹلر اور مسولینی کو دنیائے مسیحیت کا ایک وعظ بھی شر و فساد سے نہ روک سکا، اور بالآخر قوت ہی سے اُن کو زیر کرنا پڑا، اس لئے حصول قوت اور خاص خاص ناگزیر حالات میں جنگ و مقابلہ کی تعلیم امن و صلح کے خلاف نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے، اس لئے اقبال نے اخوت اور محبت اور امن و صلح کی بھی تعلیم دی ہے، اور حصول قوت کی بھی اور شر اور ظلم و جور کے مقابلہ میں جنگ و مقابلہ کی بھی، دونوں دو مختلف حالتوں کے لئے ہیں، دوستوں امن پسندوں اور نیکی اور بھلائی کے مقابلہ میں مہر و محبت اور امن و صلح کی تعلیم ہے،

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی   اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو   وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو   سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

اُن کے کلام میں اس قسم کے بکثرت اشعار ہیں لیکن ظلم و جور کے مقابلہ میں جنگ و مقابلہ کی بھی تعلیم ہے،

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غریبوں کا لہو سوز یقین سے   کنجشکِ فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

کیا انھون نے جہان بھی جنگ و مقابلہ کی تعلیم دی ہے وہ ہمیشہ ظلم و جور کے مقابلہ مین ہے امن و صلح کے مقابلہ مین نہین ہے، مہر و محبت، امن و صلح اور جنگ و مبارزت کے بارہ مین اُن کا اصول حسبِ ذیل اشعار سے واضح ہوگا،

ہو حلقۂ یاران تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیابان سے — گلستان راہ مین آئے تو جوئے نغمہ خوان ہو جا

مصافِ زندگی مین صورتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت مین حریر و پرنیان ہو جا

جس سے جگرِ لالہ مین ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤن کے دل جس سے دہل جائین وہ طوفان

اس توازن کے بغیر حق و انصاف، امن و امان بلکہ دنیا کا نظام قائم نہین رہ سکتا، حضرت مسیح علیہ السلام کی مطلق امن و صلح اور مہر و محبت کی تعلیم کی سب سے زیادہ مخالفت خود اُن کی امت کر رہی ہے، اس لئے کہ یہ تعلیم خلافِ فطرت ہے،

لیکن جس طرح مطلق مہر و محبت کی تعلیم خلافِ فطرت ہے، اسی طرح مطلق قوت بھی مضر ہے، اس لئے اقبال اس کیلئے اخلاقی قیود کا پابند ہونا ضروری سمجھتے ہین، اور مطلق طاقت کو وہ چنگیزی اور زہر ہلاہل سے تعبیر کرتے ہین،

اسکندر و چنگیز کے ہاتھون سے جہان مین — سو بار ہوئی حضرتِ انسان کی قبا چاک

تاریخ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظران نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک سیر و زمین گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہین خس و خاشاک

اس لئے وہ قوت کو مذہب و اخلاق کا پابند بنانا چاہتے ہین، چنانچہ مسلمانون کو شجاعت کے ساتھ

عدل و صداقت کی بھی تعلیم دیتے ہین،

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس سے ظاہر ہوا کہ اُن کے نزدیک شجاعت کے ساتھ عدل و صداقت ضروری ہے، اور ایسی شجاعت و قوت دنیا کے لئے سراسر خیر و برکت ہے، انکے نزدیک اصل قوت ایمان، عمل اور محبت ہے،

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی مین ہین یہ مردون کی شمشیرین

اُن کی تعلیمِ قوت کے سلسلہ مین اُن کے تمثیلی پرند شاہین پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھون نے نوجوانون کو شاہین بننے کی تلقین کی ہے، جو ایک شکاری پرندہ ہے، لیکن درحقیقت اس تمثیل کا مقصد راحت طلبی و تن آسانی، عیش و تنعم اور جمود و تعطل کی مخالفت اور جہد و عمل، سادگی و جفاکشی، اور بلند حوصلگی کی تعلیم ہے، جیسا کہ خود اُن کی نظم شاہین سے ظاہر ہے.

کیا مین نے اُس خاکدان سے کنارا — جہان رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیابان کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

نہ بادِ بہاری نہ گلچین نہ بلبل — نہ بیماریِ نغمۂ عاشقانہ

خیابانیون سے ہے پرہیز لازم — ادائین ہین ان کی بہت دلبرانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں مین — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب یہ پچھم چکورون کی دنیا — مرا نیلگون آسمان بے کرانہ

پرندون کی دنیا کا درویش ہون مین
کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

یہ اشعار خود اپنے مقصد کے ترجمان ہین، ان کے بعد اور کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہجاتی یہ تو اقبال

کے کلام سے اس اعتراض کا جواب ہوا، انھوں نے ایک خط مین بھی اس کا جواب دیا ہے، مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی

کو کسی اعتراض کے جواب مین لکھتے ہین،

"معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی مین جنگ کا حامی ہے، غلط ہے، مین جنگ کا حامی نہین ہون نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے، قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتین ہین، محافظانہ اور مصلحانہ، پہلی صورت مین یعنی اس صورت مین جب کہ مسلمانون پر ظلم کیا جائے، اور ان کو گھرون سے نکالا جائے، تو مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے، نہ کہ حکم، دوسری صورت جس مین جہاد کا حکم ہے ۹:۹ - ۹ مین بیان ہوئی ہے، ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس مین (Colleclive Security) کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے، اگر گذشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین ان آیات پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا مین جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج صدیان گذر گئی ہوتین، جمعیت اقوام جو زمانہ حال مین بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے، کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو، امن عالم کی کوئی سبیل نہین نکل سکتی، جنگ کی مذکورہ بالا صورتون کے سوا مین اور کسی جنگ کو نہین جانتا، جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا اسلام مین حرام ہے، علیٰ ہذا دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے، شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہین، اس جانور مین اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہین، خوددار اور غیرتمند ہے، کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہین کھاتا، بے تعلق ہے، کہ آشیانہ نہین بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے، تیز نگاہ ہے" (مکاتیب اقبال جلد اول ص ۲۰۳، ۲۰۵)

ان تصریحات سے حصول قوت اور جنگ و مقابلہ کے بارہ مین اقبال کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے،

(باقی)

ایک علمی خوشخبری

عربی ادب کے ایک نایاب گنجینے کی دستیابی

از

مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

دوسری صدی ہجری کے اعلیٰ درجہ کے شعراء مین بشار بن برد مادرزاد نابینا ہوتے ہوئے بھی بہترین شاعر تسلیم کیا گیا ہے، وہ کثیر الشعر بھی تھا، اور اس کا کلام بھی مقبول ہوا، لیکن وہ اشاعت حاصل نہ کر سکا، جس کا وہ مستحق تھا، اس کا سبب اس کی لامذہبی کا چرچا، بیباکی اور برسراقتدار جماعت کے ساتھ اس کا سیاسی اختلاف تھا، اس لئے اس کے اشعار کی پوری حفاظت نہین ہوئی، اور اس کے دیوان کا وجود مشکوک ہی رہا، سیف الدولہ کے دربار کے دو شاعرون نے جو بھائی بھائی تھے، اور "خالدیان" کہے جاتے تھے، اس کے کلام کا انتخاب کیا تھا، جس کی شرح پانچوین صدی کے ایک ادیب اسمٰعیل بن احمد نے لکھی تھی، یہ متن اور شرح بھی گوشۂ گمنامی مین پڑ گئے، اور بجز کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے کہین ان کا سراغ نہین ملتا، راقم الحروف نے اس مجموعے کی خدمت کی، اور مصر کی لجنۃ التالیف نے ۱۹۳۵ء مین اس کو شرح المختار من شعر بشار کے نام سے شائع کیا[1]،

جیسے ہی یہ کتاب شائع ہوئی، میرے محترم دوست اور نامور مستشرق ڈاکٹر کرنیکو نے کیمبرج سے

---

[1] ریویو کے لئے ملاحظہ ہو معارف ماہ اپریل ۱۹۳۶ء

مجھے بشار کے دیوان کے وجود کی خوشخبری سنائی، اُن کے خط مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء کا اقتباس درج ذیل ہے :-

"آج مجھے ٹونس کے شیخ الاسلام اور وزیر عدالت سیدی محمد الطاہر بن عاشور کا خط ملا ہے، انھون نے شرح المختار کا ایک نسخہ خرید ا ہے اور ان کے ذاتی کتب خانے مین ایک قلمی نسخہ دیوان بشار کا موجود ہے، جس کی وہ شرح لکھ رہے ہین، مشکوک مقامات پر وہ میری مدد کے خواہان ہین اور شرح کی تکمیل کرکے جلد شائع کرنے کا قصد ہے"

اس اطلاع پر مین نے براہ راست شیخ کو دیوان کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے خط لکھا، غالبًا یہ وہی دیوان ہے جس کا ذکر دمشق کے مجلۃ المجمع العلمی العربی ماہ کانون اول ۱۹۲۹ء مین آیا تھا، (ملاحظہ ہو ص ۱۲-۱۱۷) لیکن اس وقت میری تمام کوششین مزید معلومات کے حصول مین بے سود ثابت ہوئین، تاہم شیخ نے میرے خط کا جواب دیا، اور میری ان کی خط وکتابت جاری ہو گئی، اپنی کچھ تصانیف بھی انھون نے بھیجین، جو قدیم طرز پر بعض قصائد کی شروح تھین، بشار کے دیوان پر میرے کام کی نوعیت شیخ کے کام سے مختلف ہونے کی بنا پر مین نے اُن سے عرض کیا، کہ اس مین کسی تصادم کا اندیشہ نہین ہے اسلئے وہ اس کی نقل یا عکس مجھ کو دیدین، شیخ اس کو بطائف الحیل ٹالتے رہے، اور مین اصرار کرتا رہا کہ اس مین چار سال گذر گئے، اسی درمیان مین جنگ عظیم شروع ہو گئی، اور غیر ممالک سے کلی انقطاع ہو گیا، جنگ کے ختم ہونے پر پھر مجھے دیوان بشار کی یاد تازہ ہوئی، اس کے لئے شیخ کا حال معلوم کرنا ضروری تھا، چنانچہ متعدد ذرائع سے پتہ چلانا چاہا۔ مگر جب کامیابی نہ ہوئی، تو خود اُنہی کے نام سابق پتہ پر خط لکھا، جس کا جواب انھون نے دیا، اور لکھا کہ اب وہ شیخ الجامعۃ الزیتونیہ ہین، اور ہم دونون کو ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرکے خوشی ہوئی، یہ وہ وقت تھا، کہ میرا مرتب کردہ دیوان ابن درید مصر کی لجنۃ التالیف مین زیر طبع تھا، اس کا ایک نسخہ

شیخ کو نذر کرنے کا وعدہ کرکے پھر اپنی پرانی خواہش کا اعادہ کیا، اس پر انھون نے اپنی تصنیف مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ مجھے بھیجی، اور دیوان کے متعلق لکھا کہ اُن کی شرح چھپنے کے لئے لجنۃ التالیف مین گئی ہے، اصل دیوان بھی اسی کے ساتھ ہے، اور فوٹو کی انھون نے اجازت دے دی، اُن کی ہدایت کے موافق مین نے لجنۃ کے صدر پروفیسر احمد امین کے نام متعدد خطوط بھیجے، جو سب کے سب ضائع ہو گئے، مجبورًا دہلی کے سفیر مصر کا ذریعہ اختیار کیا، اس ذریعہ سے شیخ کو خط مل گیا، اور اسی کے جواب مین انھون نے لکھا کہ اس سے پیشتر میرا کوئی خط اُن کو نہین ملا، اور دیوان کا فوٹو بخوشی تیار کرنا منظور کیا، مین نے شیخ کی یہ تحریری اجازت لجنۃ التالیف کے پاس بھیج دی، اور جولائی ۱۹۴۹ء مین فوٹو لینے کا کام شروع ہو گیا، خدا کا شکر ہے کہ پندرہ سال کے بعد یہ علمی آرزو پوری ہوئی، اور ۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو دیوان بشار کا عکسی نسخہ میرے ہاتھ مین آگیا،

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آمد آخر زپس پردۂ تقدیر پدید

بشار کا دیوان معدوم ہونے کا خیال مختلف اشخاص کے لئے اس کے اشعار جمع کرنے کا باعث ہوتا رہا۔ دور حاضر مین آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ نے اپنا وقت اس کام مین صرف کیا تھا، انھون نے اپنا مجموعہ بعینہٖ مجھکو دینے کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن ایفا سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا، شیخ محمد الطاہر نے مجھے لکھا تھا کہ آٹھ سو اکیاون ۸۵۱ اشعار انھون نے جمع کئے ہین، اور دو مجموعے مصر سے بھی شائع ہوئے، ایک احمد حسنین القرنی کا جس کے اشعار کی تخریج ڈاکٹر کرنیکو نے کی تھی، اور دوسرا حسین منصور کا، شرح المختار کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد مین نے بھی تمام عربی لٹریچر کو کھنگال کر تقریبًا ڈیڑھ ہزار اشعار جمع کئے،

شیخ کے شمار کے مطابق اس دیوان کے دو سو چھہتر اوراق ہین، جو سات ہزار آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہین،

خط قدیم مصری ہے، کوئی تاریخ درج نہین، مگر خط کا انداز شاہد ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر کی تحریر ہے، شروع مین نہ کسی روایت کا پتہ ہے اور نہ کوئی سند درج ہے، بشار کے نسب سے کلام کا آغاز بترتیب قوافی کیا ہے، بحیثیت مجموعی نسخہ صاف ہے، بعض مقامات پر پانی پہنچ جانے کی وجہ سے حروف کچھ مٹ گئے ہین، بیچ مین قدرے خرم بھی ہے، سب سے افسوسناک بات یہ ہو کہ یہ مجموعہ صرف قافیۃ الراء تک ہے، جہان جلد اول تمام ہوتی ہے، لیکن موجودہ حالات مین جو کچھ بھی غنیمت ہو کیونکہ تقریباً ۱۲ ہزار اشعار کا مہیا ہو جانا کہین اور سے غیر ممکن ہے،

آخر مین مجھے ڈاکٹر کرینکو اور مصر کے نامور اور جامع صاحب قلم، مختلف حیثیتون کے جامع اور قدیم محترم دوست پروفیسر ڈاکٹر احمد امین بک مدیر ادارہ ثقافیہ جامع الدول العربیہ کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے، اور مسلم یونیورسٹی کے علم دوست وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لئے ضروری ہے، جنھون نے ازراہِ ادب نوازی فوٹو گراف کا خرچ منظور فرمایا،

شعر الہند حصہ اوّل

جس مین قدما کے دور سے لے کر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، قیمت :- للعہ (طبع چہارم)

شعر الہند حصہ دوم

جس مین اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، (زیر طبع)

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

فنِ خطابت

ڈیل کارنیجی امریکہ کا مشہور و معروف ماہر نفسیات ہے، اس کے ایک تازہ مقالہ کی تلخیص جو فنِ خطابت پر ہے، ذیل مین درج کی جاتی ہے،

جب کسی مقرر کا کسی موضوع پر بولنے کا ارادہ ہو تو وہ اس وقت تک نہ بولے جب تک کہ اس کو اس موضوع سے پوری واقفیت نہ ہو، اور پوری واقفیت ہی رکھنا کافی نہین ہے، بلکہ اس موضوع سے اس کو پوری دلچسپی بھی ہو، اور ایسی دلچسپی کہ اس موضوع کے متعلق جو کچھ بھی جانتا ہو، اس کو سامعین تک پہنچانے کے لئے غیر معمولی خواہش بھی رکھتا ہو،

کوئی تقریر بھی دس منٹ یا دس گھنٹے مین تیار نہین کی جاسکتی ہے، اس کے لئے دس سال چاہئین، ایک خاتون نے فنِ خطابت کے درجہ مین داخلہ لیا، کچھ ہی دنون کے بعد اس کو تقریر کرنے کے لئے کہا گیا، لیکن وہ کسی عام مجمع مین تقریر کرنے سے گھبرائی، اس کا خیال تھا کہ کسی مجمع مین تقریر کرنے کے لئے غیر معمولی صلاحیتین چاہئین، جو اس مین موجود نہین ہین، لیکن اس کے باوجود اس کو ایک برجستہ تقریر کرنے کے لئے کہا گیا، اور جب وہ تقریر کرنے لگی، تو تقریر کے دوران مین سامعین مبہوت اور دم بخود سے ہو گئے، اس کا موضوع "میری زندگی کا عظیم ترین تاسف" تھا، تقریر کو مشکل سے چھ منٹ گذرے تھے کہ سامعین کی آنکھین اشکبار ہو گئین، خاتون نے تقریر مین کہا کہ میری زندگی کا سب سے بڑا افسوسناک واقعہ یہ ہو کہ مین ماں کی محبت و شفقت سے محروم رہی، میری ماں کا انتقال اس وقت ہوا جب مین چھ سال کی تھی، میری پرورش میرے مختلف رشتہ دارون نے کی، جو اپنے بچّون کی دیکھ بھال مین ایسے منہمک رہتے تھے،

کہ میری طرف ان کو توجہ کرنے کی مطلق فرصت نہ ملتی تھی، ان رشتہ دارون مین سے کسی ایک کے پاس زیادہ دنون تک نہین رہ سکی، اس لئے کہ ان مین سے کسی کو بھی میری ذات سے کوئی دلچسپی نہین تھی، اور نہ کسی نے مجھ سے کسی قسم کی شفقت کا اظہار کیا، اور یہ مین محسوس کرتی تھی کہ مین اپنے رشتہ دارون پر بار ہون، جب مین سونے کو جاتی، تو تنہا ہوتی، اپنی تنہائی سے گھبرا کر رونے لگتی، میری بے حد خواہش ہوتی کہ اسکول سے میرے متعلق جو رپوٹ آتی اس کو کوئی دیکھنے والا ہوتا، لیکن کوئی اس کو نہ دیکھتا، اور نہ کسی کو اس کی پرواہ ہوتی، ایک چھوٹی بچی کی حیثیت سے مجھ مین یہ جذبہ پیدا ہوتا کہ کوئی مجھ کو پیار کرتا، کوئی محبت سے پیش آتا، کوئی شفقت کا اظہار کرتا، لیکن ان تمام باتون سے محروم رہی،

یہ سوچنے کی بات ہو کہ اس خاتون نے اس تقریر کی تیاری مین دس سال بلکہ بیس سال صرف کئے، اور جب وہ بچپن مین سوتے وقت تنہائی مین رویا کرتی تھی، تو گویا اسی وقت سے وہ اس کی تیاری کر رہی تھی کہ جب اس کو موقع ملے گا تو اپنے ان جذبات کا اظہار کرے گی، چنانچہ جب اس کو موقع ملا، تو اس کے یہ اندرونی جذبات تقریر مین اس طرح ظاہر ہوئے کہ سامعین مسحور ہو کر رہ گئے،

عام طور پر وہی تقریر بے جان ہوتی ہے جو لکھ کر یاد کی جاتی ہے، اور اس کے یاد کرنے مین پسینہ بہایا جاتا ہے، ایسی تقریر حصول مقصد مین بے کار ثابت ہوتی ہے، بہت ممکن ہو کہ ایک شخص جس مین تقریر کرنے کی بالکل صلاحیت نہ ہو، اگر ایسے موضوع پر بولنے کی کوشش کرے جس مین وہ خاص طور پر متاثر ہے، تو عجب نہین کہ وہ ایک موثر اور کامیاب تقریر کر سکے،

مبتدی مقررون کو ان باتون کا لحاظ مطلق نہین ہوتا، وہ اپنے موضوع کی تلاش کسی کتاب یا رسالے مین کرتے ہین، ایک اور خاتون نے فن خطابت کے درجہ مین داخلہ لیا، لیکن وہ اس مین کوئی ترقی نہین کر سکی؛ تو اس نے ایک ماہر فن سے اپنی بددلی کا اظہار کیا، ماہر فن نے پوچھا کہ آخر بار اس نے کس چیز پر تقریر کی تھی، خاتون نے جواب دیا کہ اس کا موضوع تھا کہ "کیا مسولینی حبش پر حملہ کرنے مین حق بجانب تھا"، ماہر فن نے

سوال کیا کہ اس موضوع سے اس کو کوئی دلچسپی بھی تھی، اس نے نفی مین جواب دیا، پوچھا گیا تو پھر اس پر اس نے تقریر ہی کیون کی، بولی کہ مجھکو آخر کسی چیز پر بولنا ہی تھا، اس لئے یہی موضوع منتخب کر لیا، ماہر فن نے کہا کہ اگر اس کو بولنا ہی تھا، تو اس کے لئے یہ زیادہ مناسب موضوع ہوتا کہ وہ بچون کی پرورش کس طرح کر سکتی ہے، یا خریداری کے وقت روپیون کا بہترین مصرف کس طریقہ سے لے سکتی ہے، اس کو سنکر سامعین زیادہ متاثر ہو سکتے تھے، کیونکہ ان کو اس کا پورا احساس تھا کہ خود مسولینی کے حبشہ پر حملہ کے متعلق کچھ زیادہ واقفیت نہین رکھ سکتی ہو، اس لئے ان کو تقریر سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی،

عام طور پر مبتدی مقررون کا حال مذکورۂ بالا خاتون ہی کی طرح ہوتا ہے، وہ ہر موضوع پر بولنے کی کوشش کرتے ہین، اس کا لحاظ مطلق نہین رکھتے کہ ایسے ہی موضوع پر بولین جس سے یا تو ان کو پوری واقفیت ہو، یا جو کچھ کہین اس پر ان کو خود پورا یقین وعقیدہ ہو،

اگر واقعی کوئی شخص فن خطابت مین ترقی کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کو اپنے خاص خاص تجربات پر بولنے کی کوشش کرنا چاہئے، مثلاً "میری زندگی کا عظیم ترین تاسف" "میرا عظیم ترین حوصلہ" "مجھکو اسکول کی زندگی کیون پسند یا ناپسند تھی" یا اور اسی طرح کے موضوع زیادہ موزون ہو سکتے ہین، جو شخص اس قسم کے موضوع پر بولنا شروع کرے گا تو بہت جلد اس مین خود اعتمادی اور جرأت پیدا ہوتی جائے گی، اور رفتہ رفتہ وہ دوسرے موضوع پر آسانی سے تقریر کر سکے گا، پھر اس کو موضوع کی تلاش کرنے کی ضرورت نہین ہوگی،

ایک بار ایک ٹیلیفون کمپنی کے کام کرنے والون سے یہ کہا گیا کہ ان کے ذہن مین جو بھی خیال آئے، اس کو تقریر مین پھیلا کر بیان کرین، ان مین سے ایک شخص سے جس نے کلنڈر مین یوم تشکر کے کچھ مناظر دیکھے تھے جب تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کن کن چیزون پر وہ تشکر کا اظہار کر سکتا ہے، ایک دوسرے شخص نے سڑک پر کچھ کبوترون کو دیکھا تھا، اس کو کبوتر پر

تقریر کرنے کا شوق ہوا، چنانچہ اس نے کبوتروں کے متعلق بہت سی معلومات جمع کین، اور جب اس موضوع پر اس نے تقریر کی تو کبوتروں سے متعلق اتنی باتین اور ایسے دلچسپ انداز مین بتائین کہ سامعین کبھی نہین بھولے ہون گے، لیکن ان تمام تقریرون مین جس شخص کی تقریر پر انعام ملا اس کا موضوع "کھٹمل" تھا، اس نے ایک شخص کے کالر پر "کھٹمل" رینگتے دیکھا، اس لئے اس کو کھٹمل سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ اس نے کھٹمل کے متعلق کتابین دیکھ کر اتنی باتین معلوم کرلین کہ جب اس کی تقریر ہوئی تو اتنی پسند کی گئی کہ لوگ اس کو کبھی نہین بھول سکتے،

شروع مین دنیا کے اہم مسائل مثلاً ایٹم بم وغیرہ پر تقریر کرنے کی کوشش کرنا بالکل بے کار ہے ابتدائی دور مین سیدھے سادے موضوع پر بولنا چاہئے، موضوع ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے جس سے بولنے والے کو واقعی دلچسپی ہو، ایسا ہرگز نہ ہو کہ طبیعت پر جبر کرکے دلچسپی پیدا کی گئی ہو،

فن خطابت مین حسب ذیل سات چیزون کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

۱۔ کسی تقریر کو کبھی لکھنا نہ چاہئے، جب لکھی جائے گی تو اس مین روزمرہ بول چال کے سادہ آسان الفاظ کے بجائے، ادب و انشاء کے الفاظ و فقرے منہ سے نکلین گے، اس کے علاوہ جب کوئی شخص لکھی ہوئی تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے، تو اس کے ذہن پر یہ بڑا بار ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ یاد کیا ہے وہ حافظہ مین محفوظ رہے، اور سامعین کو سنا دے، اس طرح تقریر فطری اور برجستہ نہین ہوسکتی،

۲۔ اگر تقریر یاد بھی کی جائے تو اس کو لفظ بہ لفظ نہین رٹنا چاہئے، اس طرح کی رٹی ہوئی تقریر کا بھول جانا یقینی ہے، اور جب کوئی مقرر رٹی ہوئی تقریر بھول جاتا ہے تو سامعین ہنستے ہین کیونکہ وہ مصنوعی تقریر کا سننا پسند نہین کرتے ہین، اور اگر رٹی ہوئی تقریر نہ بھی بھولے تو بھی سامعین کو اس کی آنکھوں اور اس کی آواز سے کوئی لگاؤ پیدا نہین ہونے پاتا، ہان اگر اس کا شبہہ ہو کہ تقریر کرتے وقت بعض باتین ذہن سے اتر جائین گی تو ایک کاغذ پر وہ خاص خاص باتین نوٹ کرنے مین مضائقہ

نہین اور تقریر کے دوران مین اس پر سرسری نظر ڈالتے رہنا چاہئے،

۳۔ اگر تقریر کو دلچسپ بنانا ہو تو اس کے لئے دلچسپ مثالین اور قصے بیان کرنا ضروری ہے،

۴۔ جب کوئی شخص کسی موضوع پر تقریر کرنا چاہے، تو اس پر اس کے معلومات بہت ہی وسیع ہونے چاہئین، تاکہ سامعین کو یہ اندازہ ہو کہ مقرر کے پاس موضوع سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے، اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بہت مستند ہے،

۵۔ تقریر کرنے سے پہلے اس کی تیاری اس طرح ہوسکتی ہے کہ اس موضوع پر بے تکلف دوستون سے بار بار گفتگو کی جائے، اس گفتگو سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ کن باتون سے سامعین دلچسپی لیتے ہین کس قسم کی رائے سے وہ متاثر ہوتے ہین، اور کس قسم کی ظرافت سے لطف اٹھاتے ہین، جو تقریر غسلخانے کے آئینہ کے سامنے تیار کی جاتی ہے، اس سے سامعین کی نفسیات کا اندازہ نہین ہوسکتا ہے،

۶۔ تقریر شروع کرتے وقت اس کا خیال مطلق نہین کرنا چاہئے کہ لب و لہجہ کیسا ہونا چاہئے، طریقہ کیا ہو، چہرہ کا انداز کیا ہو، آواز کیسی ہو، آواز مین کہان پر گرمی اور کہان پر نرمی ہو، ان باتون کو سوچنا فضول ہے، گو ان پہلوؤن پر بھی بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن یہ سب لغو ہے، تقریر کرتے وقت ان تمام باتون کو بھول جانا چاہئے، صرف یہ خیال رکھنا چاہئے کہ تقریر مین کیا کہنا ہے،

سامعین کے سامنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے برسون تعلیم و تربیت کی ضرورت نہین، جب کبھی مقرر کو کسی بات پر غصہ آجاتا ہے یا وہ کسی بات پر اپنی ذلت محسوس کرتا ہے یا اس کو تنگ کیا جاتا ہے، تو اس کی تقریر خودبخود عمدہ ہو جاتی ہے، اس لئے جذبات کے اظہار کا لب و لہجہ، کھڑے ہونے کا انداز اور چہرہ کی رنگت خودبخود درست ہو جاتی ہے،

امریکہ کے ایک بحری افسر نے تقریر کے درجہ مین داخلہ کرایا، وہ بڑی سے بڑی بحری لڑائی لڑنے مین بالکل نڈر رہتا، لیکن مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنے مین بے حد خوفزدہ ہو جاتا، اپنے درجہ

مین بھی اس کو تقریر کی ہمت نہ ہوتی، اس کے استادون کے ذہن مین اس کی اصلاح کے لئے یہ بات بن آئی کہ درجہ مین ایک اشتمالی (کمیونسٹ) بھی تھا، استادون نے چپکے سے اشتمالی سے کہدیا کہ تم درجہ مین یہ تقریر کرو کہ امریکہ کی ریاستہاے متحدہ مین ایک انقلاب کی ضرورت ہے، اس انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلحے کر واشنگٹن کی طرف کوچ کرین اور صدر کو گولی مار کر اشتمالی حکومت قائم کرین" اشتمالی نے موثر طریقہ سے یہ تقریر کردی، بحری افسر کو تقریر سنتے وقت غصہ آگیا، اور تقریر کے درمیان ہی مین یہ کہکر اشتمالی کو روکا کہ یہ صریحًا باغیانہ تقریر ہے، جو کسی حال مین برداشت نہین کیجاسکتی، پھر وہ مسلسل بولنے لگا کہ ریاستہاے متحدہ کے صدر نے اس ملک اور اس آزادی کے لئے کیا کچھ نہین کیا ہے، اس کی تقریر بڑی آتشین ہو رہی تھی، اسی درمیان مین بحری افسر کے استاد نے کہا، امیر البحر، مبارکباد کیسی عمدہ تقریر تم کر رہے ہو، بحری افسر جھجکا، اور اس نے کہا مین کوئی تقریر نہین کر رہا ہون، بلکہ اس اشتمالی کو سبق دے رہا ہون۔

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب مقرر کو غصہ آجاتا ہے تو مجمع کا رعب اور خوف اس کے دل سے دور ہو جاتا ہے، اور وہ لب ولہجہ کے خیال سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور جن چیزون سے لب ولہجہ درست ہوتا ہے وہ اندرونی طور پر خود کار فرما ہو جاتی ہین،

۷- تقریر کرتے وقت کسی مقرر کی ریس کرنے کی کوشش کرنا بالکل فضول ہے جس تقریر سے مقرر کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے، وہ زیادہ موثر ہوتی ہے، آج تک کوئی شخص کسی کی پوری نقالی نہین کرسکا ہے، اس لئے تقریر اچھی ہو یا بری، اپنی شخصیت کی آئینہ دار ہونا چاہئے، اگر یہ اپنے تجربات اور معتقدات پر مبنی ہے تو بہت بہتر ہے،

"ص ع"

ادبیات

موت العالم

از مولانا سید محمد یوسف بنوری مدرس دار العلوم ڈابھیل

"مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری مدرس دار العلوم ڈابھیل عربی زبان کے ممتاز ادیب ہین، ان کو اس کی نثر و نظم پر پوری قدرت حاصل ہے، کئی سال ہوئے انھون نے نفحۃ العنبر کے نام سے حضرت شیخ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری عربی مین لکھی تھی، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے وہ تلمیذ رشید ہین، اس لئے ان کی وفات پر انھون نے اپنے تاثرات عربی نظم مین ظاہر کئے ہین، اس تاریخی مرثیہ کو ان ناظرین کیلئے جنکو عربی زبان وادب سے ذوق ہے شائع کیا جاتا ہے، اس کے ترجمہ سے صفحات کی تعداد دونی ہوجاتی، جس کی گنجائش نہین ہے، اور جس طبقہ کے لئے اسکو شائع کیا جاتا ہے اسکے لئے ترجمہ کی ضرورت بھی نہین ہے" (م)

یا عین جودی بعقل لدمع کالدرر ‏ ‏ ‏ جودی بدمع فلا تبق ولا تذر

جودی بدمع غزیر ها مر هطل ‏ ‏ ‏ یزری بمزن همی من صیب المطر

جودی بدمع شجی هائم قلق ‏ ‏ ‏ جودی بفیض شئون غیر مدخر

أحری العیون بان تذری مدامعها ‏ ‏ ‏ عین بکت خطبها من غیر مصطبر

انعی الیک اماما عالما فطنا ‏ ‏ ‏ شیخا کبیرا جلیل القدر والخطر

انعی الیک وحید الدهر عالمه ‏ ‏ ‏ بحرا محیطا ملیئی القعر بالدرر

شبیر احمد شیخ القوم قدوتهم ‏ ‏ ‏ دعاه رب کریم واسع القدر

لبّا الإلٰه کریما اذ دعاه ضحیً   ضیفًا نزیلا لأغربیا راح فی سفر
محدّثٌ بارعٌ مفسّرٌ مدرّسٌ   حبرٌ کبیرٌ دقیقُ البحث والفکر
علامةٌ ذکیٌّ فهامةٌ لَسِنٌ   روض انیق جمیل النَّورِ والزّهر
محقق العصر فی علم وفی حکم   محنّک الدهر فی صعبٍ وفی حصر
فی قلبه علم قرآن وحکمته   یبدی معارفه فی کل مختصر
کم من مشاکل علم غاص لجتها   وحلها بدقیق الفکر غیر مقتصر
کم من دقائق بحث قام یکشفها   کم من حقائق ابدت دقة النظر
اذا ارتقی فی أعالی الراح لاح له   ما فی الغیوب هُنا من کل مستتر
تریک نور الذکا سیماء غرته   اذا تبلّج فی مستصعب الخبر
مفکر طال ما شجت بدائعه   أولی النُّهیٰ ببدیع الرأی کالزهر
مدبّر طالما ازهت محاسنه   فی کل معترک من کل مُستعر
حلو وقار أناءة تزیّنه   خطابة منطق کاللؤلؤ المنتثر
غور وفکر فراسة وحلیته   خطابه فی الندی عقد من الدرر
أضحت لخطبته الألباب حائرة   تری سکاری رحیق النطق من سکر
یموج موجا کموج البحر ملتطما   اذ قام حبرا خطیبا ناشر الحبر
أضحت عبارته من حسن عارضة   تجلو الغیاهب والأوهام کالقمر
بالفضل متسم بالنبل مرتسم   بالصدق معتصم فی کل مشتجر
بالحلم مدثر بالفهم متزر   بالحزم مشتمل فی کل مغتمر
جلا الظلام بنور داق منظره   بفتح ملهمه فی خدمة الأثر
فاحت بلاد بعرفٍ من فوائده   جاءت کدرِّ یتیم غالی الدرر

تجلو غیاهب ذی زیغٍ إذا قرأت   بحسن فکر وطبع صاف فی الکدر
حاز المفاخر والعلیاء مرتدیا   بثوب عز رفیع طیّبٍ عطر
له المفاخر فی الأعیان ناطقة   له المآثر فی زهو وفی نضر
له البدائع فی الأفکار بادیة   له الروائع تتری عند ذی النظر
سل أرض هندٍ فسند من مفاخره   جاءتک ناطقة من کل مفتخر
سل دولة فی بسیط السند قائمة   تنبیک دستوره بالدین فاعتبر
هو المشمّر فی تائید مقصده   حتی تأکد منه العقل بالبصر
خطب الم علی الاسلام حین قضی   نحبا وأمر الوری لم یقض بالوطر
فالقلب فی عمد والروح فی کمد   والنفس فی کبد والعین فی همر
هذا الذی ملأ الآفاق سمعته   درسا وتالیف کتب خیر مدّخر
ترثیه جامعة تبکیه عاصمة   جدیدة کمدًا أفی صیّب العبر
ترثیه اقلام علم ثمّ محبرة   مدارس کتب مکاتب الزبر
یرثیه منبرهم یبکیه جامعهم   ترثیه حفلتهم فی البدو والحضر
یا قلب مه هذه دنیا ونعمتها   تفنی سریعا وقد جاءتک بالعبر
یبقی الإله ولا یبقی بریته   فاصبر بصبر جمیل وارض بالقدر
فکل حی من الدنیا مفارقها   وکل جاءٍ غریبٌ جاء للسفر
یا رب انزل علیه صوب غادیة   وطفاء تسقی ثراه فائض الدرر
وارفعه عندک فی الفردوس منزلة   یأوی الی کنف فی غایة الخضر
وطفاء دیمتک المدرار فائضة   ترجی لمحلٍ من الغبراء مفتقر
ثم الصلوة علی خیر الوری ابدًا   من جاء بالنور فی الظلماء للبشر

مطبوعات جدیدہ

اشتراکیت اور اسلام از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے،
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ:- مکتبہ چراغ راہ کراچی نمبر ۱،

مذکورۂ بالا کتاب فاضل مصنف کی مشہور ومقبول تصنیف ہے، اس کا پہلا اڈیشن کئی سال ہوئے دار المصنفین سے شائع ہوا تھا، مصنف کے قلم سے ترمیم واضافہ کے بعد اب دوسرا اڈیشن مکتبۂ چراغ راہ نے شائع کیا ہے، جو لوگ اشتراکیت کی حقیقت سے ناواقف ہین، وہ اس کے اور اسلام کے درمیان انسانی حقوق کی مساوات، طبقاتی تقسیم کی مخالفت اور معاشی نظام کے بعض پہلوؤن مین اشتراک سے بہت کچھ اشتراک دیکھ کر دونون کو ایک دوسرے کے قریب اور کارل مارکس اور لینن کے پرستار اشتراکی نظام کو حریت آزادی اور عالمگیر انسانی اخوت ومساوات کا سب سے بڑا علمبردار اور دنیا کے تمام سیاسی ومعاشی مسائل کا مشکل کشا سمجھتے ہین، یہ دونون خیال حقیقت سے بہت دور ہین، فاضل مصنف نے اس کتاب مین اس کی مفصل ومدلل تردید کی ہے، اور اشتراکیت کی پیدائش کے اسباب اور اسکی ترقی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، اور کارل مارکس کے فلسفہ اور معاشی نظام پر بحث وتنقید کرکے اس کی خامیان دکھائی گئی ہین، اور روس مین اسکے عملی تجربہ کی مختصر سرگذشت لکھکر دکھایا ہے کہ مارکسی اشتراکیت اور مذہب دونون ایک دوسرے کی ضد ہین، اشتراکیت محض ایک سیاسی اور معاشی نظام نہین، بلکہ زندگی کا ایک مستقل فلسفہ اور پورا دستور العمل ہے جس کی بنیاد تمامتر مادیت اور الحاد پر ہے، وہ دنیا کے سارے مذاہب کا دشمن ہے اس مین خدا، مذہب اور اخلاق وروحانیت کا گذر نہین ہو سکا مقصد تمام مابعد الطبیعی تصورات وعقائد

کا مٹانا ہے اس مین معمولی اخلاق تک کی گنجائش نہین ہے، اور حصول مقصد کے لئے ہر قسم کا فریب اور جور وظلم روا ہے، آخر مین دکھایا ہے کہ جس اشتراکیت کا تجربہ روس مین ہو رہا ہے، وہ مارکس کے بہت سے اصولون سے ہٹ گئی ہے، لینن ہی نے اس مین بعض تبدیلیان کردی تھین، اور اسٹالن نے تو اس کے بنیادی اصولون کو ترک کرکے اشتراکیت کی روح ہی ختم کردی ہے، اور اب وہ حریت وآزادی اور معاشی حقوق مین مساوات کی عالمگیر انقلابی دعوت نہین رہی، بلکہ بدترین قسم کی آمریت اور استبداد بن گئی ہے، اس مین نسلی وجغرافی قوم ووطن پرستی کی خرابیان بھی پیدا ہوگئی ہین، اس نے ذاتی ملکیت کے بھی بہت سے حقوق مان لئے ہین، اور اسٹالنی اشتراکیت مین مارکسی اشتراکیت کی مادی خصوصیات بھی ختم ہوگئی ہین، اور اب وہ محض ایک آمرانہ نظام رہ گیا ہے، کتاب کے آخر مین اختصار کے ساتھ اسلام کا معاشی نظام پیش کیا گیا ہے اور اس کی خصوصیات اور خوبیان دکھائی گئی ہین، اس کتاب کے مطالعہ سے اشتراکیت کا مصنوعی چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے، اور اس کے اصلی خط وخال نگاہ کے سامنے آجاتے ہین، لائق مصنف نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ مشہور اور مستند اشتراکی مصنفین کی کتابون سے لکھا ہے، اس لئے یہ کتاب اشتراکیت سے حسن ظن رکھنے والون خصوصاً ان گم کردہ مسلمان نوجوانون کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہین،

وقائع عالم شاہی (فارسی) بہ تصحیح وتحشیہ جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی،
ضخامت:- ۲۳۲ صفحے کاغذ، بہتر، ٹائپ خوبصورت، مجلد قیمت مرقوم نہین، پتہ: کتبخانہ ریاست رامپور،

اس کتاب کا مصنف کنور پریم کشور فراقی، راجہ جگلکشور کا پوتا تھا، راجہ جگلکشور، مرشدآباد کا جاگیردار اور بنگال کے صوبہ دار مہابت جنگ کی جانب سے محمد شاہی دربار مین وکیل تھا، اس لئے اس زمانہ کے امیرزادون کی طرح کنور پریم کشور کی بھی اچھی تعلیم وتربیت ہوئی تھی، اور وہ اس عہد کے تمام مروجہ فنون مین ماہر اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھا، لیکن دادا کی غلط بخشیون سے اس کی زندگی ہی مین دولت وامارت ختم ہوگئی

تھی، اس نے فراقی کو تلاش معاش کے لئے گھر سے نکلنا پڑا، اور مرہٹہ گردی کے زمانہ مین جب شاہ عالم افراسیاب خان کے بلاوے پر دلی سے اگرہ کے لئے روانہ ہوا تو فراقی بھی راستہ مین شاہی لشکر مین داخل ہو گیا، اور کئی مہینہ تک بادشاہ کے ہمرکاب رہا، اور بعض متوسلین شاہی کی فرمائش پر اس نے ۱۲ محرم ۱۱۹۹ھ سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا، جس کا سلسلہ ۱۱ ربیع الاول سنہ مذکور تک جاری رہا۔ مذکورہ بالا کتاب یہی روزنامچہ ہے، اس کی تمہید مین مصنف نے احمد شاہ کے نابینا کئے جانے کے واقعہ سے لیکر شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی تک کے مختصر واقعات بھی لکھدیئے ہین اسطرح یہ کتاب دو حصون مین تقسیم ہو گئی ہے، ایک حصہ تاریخ کا، دوسرا روزنامچہ کا، اگرچہ یہ روزنامچہ بہت مختصر ہے یعنی اس مین کل دو مہینون کی روداد ہے، لیکن یہ زمانہ اس حیثیت سے نہایت اہم ہے کہ اسی زمانہ مین مرہٹہ گردی شروع ہوئی، افراسیاب خان مارا گیا، اور مہاجی سندھیا پٹیل کا اقتدار شروع ہوا، اور چونکہ فراقی نے واقعات غیر جانبدارانہ لکھے ہین، اور ان کی شکل روزنامچہ کی ہے، اس لئے اس مین اس زمانہ کے بہت سے ایسے واقعات مذکور ہین، جو دوسری تاریخون مین نہین مل سکتے، اور فاضل مصحح کے بقول "اس سے شاہ عالم ثانی کی بے بسی، مرہٹون، جاٹون، اور راجپوتون کے متعلق بہت سی جزئیات کا پتہ چلتا ہے" یہ روزنامچہ نایاب اور ہندوستان کے بڑے بڑے مورخون کی نگاہون سے اوجھل تھا، چنانچہ الیٹ نے بھی اس کا تذکرہ نہین کیا ہے، اس کا صرف ایک نسخہ رامپور کے کتب خانہ مین تھا، اس لئے اس کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے فاضل مصحح نے اس کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ روزنامچہ بھی ان کی تصحیح کردہ دوسری کتابون کی طرح تصحیح و ترتیب کی تمام خوبیون سے آراستہ ہے، کتاب کے شروع مین ان کے قلم سے فراقی کی ذات و خاندانی حالات، روزنامچہ کے قلمی نسخہ کی کیفیت اور اس کے مندرجات اور خصوصیات پر تبصرہ ہے، کتاب کا پہلا جز یعنی تاریخ کا حصہ بہت تشنہ ہے اسلئے مرتب نے کتاب کے آخر مین اس کے متعلق دوسرے معاصر مورخین کے بیانات حاشیہ کے طور پر نقل کر دیئے ہین، یہ تحشیہ فاضل

مرتب کی محنت اور تلاش و جستجو کا نمونہ ہے، جس کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، آخر مین کتاب کے اسماء و اعلام کا اشاریہ ہے، یہ کتاب گو مختصر ہے، لیکن تاریخ ہند کے طالب علمون کے لئے بڑی کارآمد ہے،

اسلام کا نظریۂ جہاد از مولانا حیدر زمان صاحب صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور،

اسلامی مسائل مین سب سے زیادہ غلط فہمی جہاد کے متعلق ہے، اس کے معنی عموماً یہ سمجھے جاتے ہین کہ غیر مسلمون کے ملک پر قبضہ کرنے اور ان کو زبردستی مسلمان بنانے کیلئے ننگی تلوارین لیکر چڑھ دوڑنا، اور جو شخص اسلام سے انکار کرے، اس کو بے دریغ قتل کر دینا جہاد کی اس سے زیادہ غلط تعبیر نہین ہو سکتی، اولاً جہاد کے معنی محض جنگ و مقاتلہ کے نہین ہین، بلکہ ہر وہ کوشش جو کسی نیک مقصد کے لئے خدا کی راہ مین کی جائے جہاد ہے، حتی کہ اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش بھی جہاد ہے، اور دوسرے جنگ و قتال کے معنی مین بھی جہاد کے معنی مطلق جنگ کے نہین ہین، بلکہ اس سے مراد وہ جنگ ہے، جو اسلام کے بلند مقاصد کے تحفظ اور انسان کی فلاح و سعادت کے لئے ان دشمنانِ اسلام کے مقابلہ مین کیجائے جو اسلام اور مسلمانون کے مٹانے کے درپے اور فتنہ و شر کے لئے آمادہ ہون، ملک گیری اور دوسری قومون کو محکوم بنانے کے لئے جنگ کرنا جہاد نہین ہے، اس کے مقاصد اتنے بلند و پاکیزہ اور اس کے شرائط اتنے سخت ہین کہ اگر ان کے مطابق جہاد کیا جائے، تو وہ جنگ نہین رہ جاتا، بلکہ ایک مقدس عبادت بن جاتا ہے، اس کے لئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ خالصۃً لوجہ اللہ ہو، اس مین کوئی دنیاوی غرض شامل نہ ہو، اس سے ساری دنیاوی لڑائیان جہاد سے خارج ہو جاتی ہین، اور وہی لڑائیان جہاد کہی جائین گی، جو خدا کی خوشنودی کے حصول فتنہ و شر کے استیصال اور نیکی اور بھلائی کی اشاعت کے لئے کیجائین، اس لئے جہاد درحقیقت انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے، پھر اس کے جنگی پہلو مین بھی اسلام نے اس قدر اصلاح کر دی ہو کہ اس سے جنگ و مقاتلہ کی ساری برائیان دور ہو گئی ہین، فاضل مصنف نے اس

کتاب مین اسی نقطہ نظر سے اسلامی جہاد پر بحث کی ہے، اور جہاد کے مقاصد، اس کے شرائط، دنیاوی لڑائیون اور جہاد کے فرق، اس کی حربی اصلاحات وغیرہ کو تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے اور اس کے متعلق تمام غلط فہمیون کو دور کرکے اس کی اصل حقیقت ظاہر کی ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب نہایت مفید اور خصوصیت کے ساتھ ان لوگون کے مطالعہ کے لائق ہے، جو جہاد کو بھی دنیاوی جنگ سمجھتے ہین،

حرفِ اول و سیاست نامۂ عالم از جناب نگہت شاہجہان پوری تقطیع اوسط ضخامت علی الترتیب ۱۲۲، اور ۸۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ مکتبہ سلطانیہ ابراہیم رحمت اللہ رو ڈ بمبئی نمبر ۳

مصنف علمی وادبی حلقہ مین بیگانہ نہین، وہ ایک قادر الکلام شاعر اور سنجیدہ نگار صاحب قلم ہین، ان کی نظم ونثر کی متعدد قابلِ قدر تصنیفین شائع ہو چکی ہین، زیر نظر کتاب اُن کے کلام کا نیا مجموعہ ہے، مصنف کا ذوق بڑا متنوع اور ہمہ گیر ہے اور شاعری کی ہر صنف مین ان کو یکسان قدرت حاصل ہے، چنانچہ یہ مجموعہ بھی غزل، مذہبی وملی، قومی وسیاسی، جذباتی ورومانی، اخلاقی وحکیمانہ، عارفانہ وصوفیانہ مختلف النوع منظومات کا بوقلمون گلدستہ ہے، بڑا حصہ نظمون کا ہے، غزلین برائے نام ہین، یہ تمام نظمین زبان وبیان کی خوبی اور خیالات کی بلندی وپاکیزگی جملہ ظاہری ومعنوی محاسن سے آراستہ اور بیشتر نظمین مصنف کے دینی جذبات کا آئینہ ہین، خصوصاً سیاست نامۂ عالم ان کی قادر الکلامی کا بہت اچھا نمونہ ہے، یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے جس مین بارگاہ ایزدی مین اقوام عالم کی پیشی کی تمثیل مین ان قومون کی زبان سے انکے حالات، اعمال اور اُن کی سیاست پر نہایت دلچسپ اور مفید تبصرہ ہے، حرفِ آول کے شروع مین جناب سراج احمد صاحب علوی پروفیسر گاندھی فیض عام کالج شاہجہان پور کا مقدمہ اور سیاست نامۂ عالم کے آغاز مین فیصل الاسلام صاحب پروفیسر سیاسیات جی ان کالج شاہجہان پور کی تقریظ ہے، دونون کتابین اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہین،

"م"

جلد ۶۵ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۰ء عدد ۲

مضامین